فیضانِ ابوالکلام

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات، مقالات، خطبات، خطوط اور
دیگر تحریرات سے ماخوذ فکر انگیز، انقلاب آفریں اور ایمان افروز
اقوال، شگفتہ کلمات اور حسین نگارشات کا ایک خوبصورت مجموعہ

مرتبہ
ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

فیضانِ ابوالکلام

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات، مقالات، خطبات، خطوط اور دیگر تحریرات سے ماخوذ فکر انگیز، انقلاب آفریں اور ایمان افروز اقوال، شگفتہ کلمات اور حسین نگارشات کا ایک خوبصورت مجموعہ

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

اشاعت ۲۰۰۲ء

قیمت [redacted] /- روپے

غیر ممالک کے لیے ۶ ڈالر

طابع و ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

حرفِ آغاز

زیرِ نظر کتاب کے مؤلف اور ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری (مقیم حال کراچی۔ پاکستان) علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ متعدد اہم کتابوں کے مؤلف، مرتب اور مدون ہیں۔ اور یہ تمام کتابیں برصغیر ہندوپاک میں قبول عام حاصل کرچکی ہیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری کو بھی آپ کی کئی کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت نصیب ہوچکی ہے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ ان کتابوں کی طباعت سے لائبریری کے اشاعتی منصوبوں کی افادیت اور وقعت میں اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ اور تحقیق کا خاص موضوع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں انہیں مولانا سے گہری عقیدت ہے اور اب یہ عقیدت بڑھ کر عشق کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود مولانا پر بہت کچھ لکھا ہے اور مختلف زاویوں سے لکھا ہے، بلکہ اپنے احباب اور معاصرین سے بھی کئی اہم اور مفید کتابیں تالیف کرائی ہیں۔ اور اس طرح انہوں نے مطالعات آزاد کو نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد عجیب وغریب دلکش اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ جو ان سے ملتا، وہ انہیں کا ہوجاتا۔ جو ان سے اختلاف کرتا، وہ ان کے حسن سیرت اور وسعت اخلاق سے حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ دراصل ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی، اور ہر پہلو انتہائی روشن اور نگاہ کو خیرہ کرنے والا تھا۔ وہ مذہب، ادب، سیاست، حکمت، صحافت، خطابت، غرض ہر فن کے بادشاہ تھے۔ وہ مدبّر بھی تھے، مفکر بھی، زمانے کے رمز شناس بھی تھے اور سیاست کے نبض شناس بھی۔ انہوں نے جس میدان میں بھی پائمردی کی اس میں ایسے روشن نقوش چھوڑے جنہیں گردِ زمانہ کبھی دھندلا نہ کرسکے گی۔ ملک وقوم کے لیے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ علامہ اقبال کی زبان میں وہ نرم دم گفتگو، لیکن گرم دم جستجو رہتے تھے۔ مولانا کی شخصیت کا یہ اعجاز ہے کہ انہوں نے جس نظریہ کی آخری لمحے تک مخالفت کی اور جس کی پاداش میں وہ اس نظریے کے حامل رہنماؤں کے سب وشتم اور تحقیر وتضحیک کا شکار ہوئے، اسی ملک کے عوام کو اپنے رہنماؤں سے زیادہ مولانا سے عقیدت اور

دلچسپی ہے۔ وہاں سب سے زیادہ کتابیں مولانا کی ہی چھپتی ہیں اور سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے ثبوت کے طور پر زیرنظر کتاب کے تعارفی حصہ سے ایک اقتباس پیش کرنا کافی ہوگا۔ مؤلف فرماتے ہیں:

''آزادی کے بعد پاکستان مولانا آزاد کے مطالعہ و تحقیق کا سب سے بڑا علاقہ رہا ہے۔ ان کی کتابوں کے مختلف ناشرین نے اتنے ایڈیشن شایع کیے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی برسوں میں ایک جائزے کے مطابق ابوالکلام سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مذہبی و علمی شخصیت تھے۔ بعد کے برسوں میں ان کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔'' (ص ۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں مولانا آزاد کو زندہ رکھنے اور عوام و خواص کے دلوں میں ان کی عظمت کو مستحکم کرنے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے مولانا کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے مذہبی، ادبی اور تعلیمی افکار سے بڑے حسین اور دل نشین انداز میں لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں انہوں نے مطالعۂ آزاد کا بڑا انوکھا اور دلچسپ انداز اختیار کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا آزاد کی تصنیفات و تالیفات، خطبات و مقالات اور مکاتیب وغیرہ سے ایسے اقتباسات اخذ کر کے جو بقول ان کے انقلاب آفریں اور ایمان افروز ہیں ایک سلسلہ میں پرو دیا ہے۔ ان اقوال کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: مذہبیات، سیاسیات اور فلسفہ و علوم و فنون۔ آج کل کی مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی میں اس نوع کی کتابوں کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد مولانا کی بیشتر تصانیف کے بالاستیعاب مطالعہ سے بے نیازی ہوجاتی ہے۔ ابتدا میں 'صاحب اقوال' کے عنوان سے مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت اور معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

محمد ضیاء الدین انصاری
ڈائرکٹر

فہرست

حصہ دوم : سیاسیات

صاحبِ اقوال

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ زادہا شرفہا میں پیدا ہوئے۔ وہی سرزمین مطہرہ وطیبہ ان کا مادری وطن تھا۔ آبائی وطن دہلی مرحوم تھا۔ ان کے والد گرامی مولانا خیر الدین (۱۹۰۸ء۔۱۸۳۱ء) نے خانوادہ ولی اللٰہی کے اساتذہ سے تحصیل علمی کی تھی۔ ان اساتذہ کرام میں ان کے نانا شیخ منور الدین، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا رشید الدین کے نام آتے ہیں۔ حدیث کی تکمیل حجاز پہنچ کر شاہ محمد یعقوب دہلوی (نواسہ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) نیز دیگر علمائے حجاز سے کی تھی۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے پیر اور صاحبِ ارشاد بزرگ تھے۔ بمبئی، کلکتہ اور ان کے اطراف واکناف میں ان کے ہزاروں مرید تھے۔

مولانا خیر الدین ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے اپنے نانا شیخ منور الدین کے ہمراہ دہلی سے ہجرت کے ارادے سے نکلے تھے۔ رام پور ہوتے ہوئے بھوپال پہنچے ہی تھے کہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھیں کچھ عرصہ بھوپال میں قیام کرنا پڑا۔ حالات درست ہوئے تو روانہ ہوئے بمبئی پہنچ کر مولانا منور الدین بیمار پڑ گئے اور وہیں انتقال فرما گئے۔ نانا کے انتقال کے بعد مولانا خیر الدین نے ہجرت کا ارادہ فسخ نہیں کیا۔ تنہا مکہ مکرمہ پہنچے۔ اولاً حدیث اور دیگر علوم کی تحصیل وتکمیل کی، پھر حرم میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ محمد بن ظاہر وتری کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ مولانا نے لکھا ہے:

> "میری والدہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں۔ جو گذشتہ دور کے اکثر علمائے حجاز کے استاد حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ مکرمہ کے آخری محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا"۔ (تذکرہ، ص ۲۵)

مولانا خیر الدین نے ذریعۂ معاش کے طور پر کسی صاحب کی شرکت میں کاروبار کر لیا تھا۔ سیر وسیاحت کا شوق تھا، مصر، شام، ترکی، عراق کے سفر کیے۔ تقریباً ۱۸۹۸ء میں

ہندوستان تشریف لائے۔ پہلے بمبئی کو مستقر بنایا بعدہٗ کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی۔ اگرچہ حجاز واپسی کا عزم فسخ نہیں کیا تھا، لیکن مختلف موانع پیش آتے رہے اور واپسی کا سفر ٹلتا رہا یہاں تک کہ اگست ۱۹۰۸ء میں کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مانک تلہ کے قبرستان میں محو خواب ابدی ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تین بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی تعلیم کا آغاز حجاز میں ہو چکا تھا، کلکتہ پہنچ کر ان کی تعلیم کے لیے رام پور، سہارن پور، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ کے بلند پایہ اساتذہ کا انتظام کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء تک وہ درسِ نظامی مکمل کر چکے تھے۔ تکمیل کے بعد درجہ علیا کے طلبہ کی ایک جماعت کی تدریس ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔

ابھی وہ اپنی تعلیم کے مرحلے سے گزرے نہ تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ ان کا کلام گل دستوں میں جگہ پانے لگا۔ شاعری کے شوق کی تکمیل کے لیے ایک گل دستہ نکالنا بھی ضروری سمجھا۔ ۲۔۱۹۰۱ء میں صحافت کے کوچے میں قدم رکھا۔ المصباح اور نیرنگ عالم کے نام سے یکے بعد دیگرے دو گلدستے جاری کیے۔ امام غزالی وغیرہ کے بعض رسائل کا ترجمہ بھی کیا۔ بعض موضوعات پر خود بھی رسائل لکھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے کلکتہ ہی سے لسان الصدق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کی اشاعت سے ان کی شہرت ملک کے علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں عام ہو گئی۔ علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، وحید الدین سلیم پانی پتی، مولانا عبدالرزاق کان پوری وغیرہ سے تعارف کا ذریعہ لسان الصدق ہی بنا۔ بعض سے تعارف پہلے سے تھا، ان سے تعلقات میں استواری آئی۔ صحافتی حلقے میں لسان الصدق کی خوب پذیرائی ہوئی۔ خدنگ نظر اور الندوہ (لکھنؤ) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور وکیل (امرتسر) اور دارالسلطنت (کلکتہ) کے ایڈیٹر بنے۔ ان کے ذریعے سے ان کی علمی و ادبی شہرت ملک کے کونے کونے تک پہنچ گئی۔ اس زمانے کے اور رسالوں میں انھوں نے مضمون نگاری بھی کی اور متعدد گل دستوں میں ان کا کلام بھی شائع ہوتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ شاعری سے ان کی دل چسپی کم ہوتی چلی گئی۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنا مشہور اخبار الہلال اور ۱۹۱۵ء میں البلاغ جاری کیا۔ ان کے علاوہ کلکتہ ہی سے روزنامہ اقدام (۱۶۔۱۹۱۵ء) زیرادارت مولوی محی الدین قصوری، ہفت

روزہ پیغام (۱۹۲۱ء) ،ماہنامہ الجامعہ (عربی، ۲۴-۱۹۲۳ء) ،الہلال (۱۹۲۷ء)، اور پیام (۱۹۳۰ء) جاری ہوئے۔ آخر الذکر چاروں رسالوں کے منتظم اور ذمہ دار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ مولانا آزاد ان کے نگراں وسرپرست تھے۔ ان اخبارات نے مولانا آزاد کی شہرت کو عام اور سیاسی حلقوں تک بھی پہنچادیا۔ ایک قومی سیاسی رہنما، استعمار دشمن اور صاحب عزیمت واستقامت کی حیثیت سے ان کی شخصیت کو ملک اور عوام میں معروف اور مسلمانوں میں مقبول بنادیا۔

صحافت ہی کے ذریعے سے وہ ملک میں ایک مقبول رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے اور صحافت ہی کے تعلق نے ان پر ابتلاو آزمائش اور قید و نظر بندی کے دروازے کھولے۔ الہلال کی ضمانت ضبط ہوئی پرچے ضبط ہوئے۔ بندش عمل میں آئی۔ بار بار پریس کی تلاشیاں لی گئیں۔ ترجمان القرآن اور دیگر اہم کتب کے نہایت قیمتی مسودات ضائع ہوئے۔ پونے چار سال تک مسلسل رانچی (بہار) میں جلاوطن اور نظر بند رہے۔ تمام کارخانہ معیشت درہم برہم ہو گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو نظر بندی سے رہائی ملی تو تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس ابتلاو آزمائش میں پڑ گئے۔ تقریباً دو سال کے بعد دسمبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے اور دو برس کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ اگرچہ جنوری ۱۹۲۳ء میں ایک سال کے بعد ہی رہائی مل گئی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے مولانا خلافت کمیٹی، جمعیت علمائے ہند اور کانگریس کے صف اول کے مقبول رہنما تھے۔ تینوں جماعتوں کے دو دو مرتبہ صدر رہ چکے تھے۔ کانگریس کے آخری مرتبہ چھ برس تک (۱۹۴۰-۴۶) صدر رہے تھے۔

انھوں نے ہر چند چاہا کہ تصنیف و تالیف کی زندگی بسر کریں یا کم از کم کسی ایسے ٹائم ٹیبل پر عمل کریں جس میں سیاسی زندگی کے ہنگامے علمی زندگی کے معمولات کو متاثر نہ کر سکیں۔ لیکن اس کے بعد ان کی زندگی کا جو دن بھی آیا وہ سیاست میں الجھتے اور علمی اور تصنیف و تالیف کی زندگی سے دور ہوتے چلے گئے۔ جیل کے دروازے ان کے لیے کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ ۱۹۳۷-۳۹ء میں وہ کئی صوبوں کی کانگریسی حکومتوں کے نگراں تھے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں عارضی حکومت کے رکن چنے گئے تھے۔ آزادی کے بعد اپنی وفات تک وہ مرکزی حکومت کے ایک اہم رکن تھے۔

ان کی پوری زندگی مسلمانوں کی خدمت اور ملک کی رہنمائی میں گزری تھی، لیکن وطنی اور قومی وملی خدمات میں آزادی کے بعد مسلمانوں کی دستگیری اور تعصب کے بلا خیز طوفان میں ملک کی دستوری رہنمائی اور سیکولر دستور بنوانے میں ان کے مساعی ان کی عظیم الشان ملی اور قومی خدمات ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ایک مذہبی زندگی کے ساتھ سیاست ، جمہوریت، قومیت، ترقی پسندی، آزادی کی جدوجہد اور قوم وملت اور انسانیت کی خدمت میں مصروف رہے۔ وہ برصغیر کی آزادی کی جدوجہد سے لیکر اسلامی ممالک اور دنیا کی مظلوم توموں کی آزادی اور جمہوریت کے حصول ودفاع اور امن کے قیام کے لیے مسلسل مصروف جہاد رہے۔ انھوں نے ہر دائرہ عمل میں اپنی انفرادیت کو منوایا اور بے شمار موانع ومشکلات کے باوجود تاریخ میں اپنا خاص مقام بنا گئے۔ وہ اگرچہ ایک علمی وتہذیبی شخصیت اور مذہبی اسکالر تھے اور ان کا خاص ذوق تحریر وتصنیف اور تالیف وتدوین علوم ومعارف کا تھا لیکن ملک کی تمام قومی وملی تحریکات میں انھوں نے ملک وقوم اور ملت کی رہنمائی کی۔ سیاست میں ان کا شمار صف اول کے کل ہند قومی رہنماؤں اور عالمی سیاسی مفکرین میں ہوتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین ایک قدامت پرست اور رجعت پسند عالم دین اور صوفی بزرگ تھے۔ ابوالکلام نے آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف تقلید اور روایت پرستی کا دور دورہ دیکھا۔ زندگی پر جمود چھایا ہوا تھا۔ آزاد خیالی اور ترقی پسندی کی زندگی کا نام ونشان نہ تھا۔ شاہراہِ تقلید کے سوا جدت پسندی اور اجتہاد فکر کے ہر نقشِ قدم کو مٹا دیا گیا تھا اور ان تمام دروازوں بلکہ دروازوں اور شگافوں کو بھی بند کر دیا گیا تھا، جن سے جدید افکار اور آزاد خیالی کی روشنی کی کوئی کرن اندر آسکتی تھی۔ ان کی ابتدائی زندگی گھر کی چہار دیواری تک محدود تھی، جس میں تین بہنوں اور ایک بھائی کے سوا کوئی صحبت بہم نہ تھی۔ باہر کے بچوں کے ساتھ ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ تنہا باہر نکلنے اور آزادانہ کھیل کود کی آزادی مفقود تھی۔ باہر نکلتے تو خادم ساتھ ہوتا تھا۔ اس ماحول میں ابوالکلام کی طبیعت بھی مجمع سے بیزار، بھیڑ سے گریزاں، گوشہ نشینی سے مانوس اور خلوت پسند ہوتی چلی گئی۔ اسباق کے مطالعہ ودرس سے فرصت نہ تھی۔ شوق پیدا ہوا تو کتب ورسائل کے مطالعے، تحریر وکتابت اور شاعری کا! جس

کے لیے پہلی اور آخری ضرورت ہی سکون و فراغت اور کتاب اور گوشہ نشینی کی ہوتی ہے۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

لیکن جب موسم بہار آتا ہے تو اس کی مستی سبزہ اور برگ و گل پر چھا جاتی ہے اس کی خوشبو کو چمن کی دیوار اونچی کر کے روکا نہیں جاسکتا۔ فضا کے معطر ہونے اور دلوں پر اس کے اثرات چھاجانے کے لیے اتنا کافی ہے کہ موسم بہار آپہنچا ہے۔ قدرت کی فیض بخشیاں ذرائع کی محتاج نہیں ہوتیں، وہ اپنی راہ خود نکال لیتی ہیں۔ اگر پھولوں کی خوشبو پھیلانے کے لیے مالن کی ٹوکری میسر نہ آئے جو کوچہ و بازار میں خوشبو پھیلائے تو وہ صبا کے پروں پر اڑا کے خوشبو کے جھونکے دیوار چمن کے باہر بھیج دیتی ہے۔ ابوالکلام کے مربی مجازی نے ان کے لیے یہی مناسب سمجھا تھا کہ باہر کی روشنی اور ہوا کے لیے ان پر دیوار کا ایک ایک سوراخ اور دروازے کا ایک ایک شگاف بند کر دیا جائے لیکن منعم و مربی حقیقی کی بخشش و نوال نے حکم دیا کہ ہر سوراخ فیض رسانی کے لیے دروازہ بن جائے۔ ابوالکلام کی تعلیم کے لیے جو دروازہ کھولا گیا تھا اگر چہ اس سے آنے والے اساتذہ کو بہت جانچ پرکھ کر اندر آنے کی اجازت دی جاتی تھی اور باہر کی آلودگی سے ان کے دامن کو جھٹک کر اطمینان کر لیا جاتا تھا، لیکن ان کا معمولی تعلق ہی ابوالکلام کے ذوق و نظر کے انقلاب کا سبب بن گیا اور ان کے شوق علم و مطالعہ نے اسی جامد ماحول اور روایت و تقلید پرستی کی فضا کو ذوق و فکر کی نئی فصل کے نشو و نما کا سامان اور اس کی آبیاری کا وسیلہ بنا دیا اور سر و سامان تعلیم و تربیت کے متوقع نتائج کے بالکل برعکس ایک ایسی شخصیت کا ظہور ہوا۔ جسے اس عہد میں فیضان الٰہی اور علوم و معارف ربانی کی تعلیم و اشاعت اور قدرت کی بخشش و نوال کا ذریعہ بننا تھا۔ ابوالکلام اسی شخصیت کا نام ہے۔

اپنے والد کی روایتی زندگی کے خلاف ابوالکلام نے علم و بصیرت اور حق پسندی کی جو راہ اختیار کی تھی، اس کے اسرار و حکم ان پر کتاب و سنت کے گہرے مطالعے، تاریخ اسلام کی کامل بصیرت گرد و پیش کے مکمل شعور اور وقت کے تقاضوں کے قطعی ادراک کے بعد ان کی فراستِ ایمانی نے ان پر منکشف کیے تھے۔ انہیں اپنے مطالعہ و رائے کی سچائی پر، فیصلہ و مسلک کی صحت اور اپنے عقیدے کی حقیقت پر پختہ یقین تھا۔ انھیں اس راہ میں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن انھیں نہ اپنے عقیدے میں کوئی شبہ پیدا ہوا نہ پائے ثبات میں ایک لمحے کے لیے

لغزش ہوئی۔ انھوں نے عزیمت دعوت کی جو راہ اختیار کی تھی، اس پر پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ تاآں کہ جوار رحمتِ الٰہی میں پہنچ گئے۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ملک کی عارضی حکومت میں تعلیم کا قلم دان وزارت ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد بھی جو دو تین بار حکومتیں بنیں، ان میں ہر بار وہ وزیر تعلیم کی حیثیت ہی سے شریک کیے گئے۔ یہ منصب ان کے ذوق کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے تعلیمی نظام کو جدید خطوط پر مرتب کیا اور ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کا نظام ملکی ضرورتوں اور قومی امنگوں کے مطابق قائم کیا اور ہر قسم کی تعلیم، فنون، سائنس، ٹیکنولوجی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ادنیٰ و اعلیٰ اداروں کا پورے ملک میں جال پھیلا دیا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دس گیارہ برس کی مدت میں انھوں نے ملک کی آیندہ ترقی کے لیے پختہ و مستحکم بنیادیں قائم کر دی تھیں۔

مولانا آزاد نے مختلف علوم و فنون میں بہت قیمتی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ تاریخ عزیمت دعوت میں تذکرہ، تفسیر میں ترجمان القرآن، تاریخ و سیاست اور فقہ میں مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد قول فیصل، انڈیا ونس فریڈم ادب و مکاتیب میں غبار خاطر اور بعد میں مرتب ہونے والے مجموعے نقش آزاد تبرکات آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، مکاتیب کے مجموعے ادب، خود نوشت، مذہب، تعلیم، فلسفہ، تاریخ کے مباحث کا ناقابل فراموش سرمایہ ہیں۔ ادب و شعر میں ارمغان آزاد کلیات آزاد خطبات کے مجموعے اور اسپیچز آف ابوالکلام آزاد، مضامین و مقالات کے بے شمار مجموعے یادگار ہیں۔ صحافت میں لسان الصدق، پیغام، الہلال و البلاغ، صحافت، مذہب اور اردو زبان و ادب کی تاریخ کا یادگار سرمایہ ہیں۔

مولانا نے ادب، تاریخ، سیاست، صحافت، فلسفہ، تعلیم، مذہب، اور مذہبی علوم کی مختلف شاخوں مثلاً، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت و سوانح وغیرہ میں جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، وہ علمی حیثیت، عملی افادیت، افکار کی بلندی، مطالب کی دل نشینی، زبان کے حسن، انشاء کی خوبی، طرز نگارش کی دل کشی کے گوناگوں خصائص کا حامل اور اردو ادب اور علوم و فنون کی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہے۔

آزادی کے بعد پاکستان مولانا آزاد کے مطالعہ و تحقیق کا سب سے بڑا علاقہ رہا ہے۔ ان کی کتابوں کے مختلف ناشرین نے اتنے ایڈیشن شائع کیے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی برسوں میں ایک جائزے کے مطابق ابوالکلام سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مذہبی علمی شخصیت تھے۔ بعد کے برسوں میں ان کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔

مذہبی لٹریچر میں ان کی ذہنی سطح گروہی اور جملہ فرقہ وارانہ سطح سے بہت بلند واقع ہوئی تھی۔ ان کا اندازِ فکر حقیقت پسندانہ اور افکار میں زیادہ وسعت ہے۔ سیاسی افکار و مسائل میں ان کی تحریرات کی اہمیت اور افادیت کا دائرہ زیادہ ہے۔ سیاسی تنقید میں ان کی زبان و قلم متوازن، انکا رویہ معتدل اور لیث لہجہ شریفانہ رہا۔ ان کی زبان یا قلم سے کسی معاصر کے بارے میں کبھی کوئی سخت لفظ نہیں نکلا۔ ان کے راست اور حقیقت پسندانہ اندازِ فکر کے ساتھ ان کے فہم و فراست اور آزادی کی جنگ میں ان کے عظیم الشان کردار کا اعتراف کیا گیا۔ ایک اہم بات یہ احساس ہے کہ آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام، قوم پرور مسلمانوں اور جمعیت علمائے ہند نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بے نظیر خدمات انجام دیں، ان میں اعتماد پیدا کیا، ان کے قدم جمائے، ملک اور وطن کی خدمت کے لیے انھیں قومی دھارے میں شامل کیا اور ان کے قومی کردار کے بارے میں شکوک و شبہات کو دور کیا۔ اگر آج ہندوستان میں مسلمان حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے حالیہ مسائل اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے قابل ہوئے ہیں تو اس میں سب سے زیادہ حصہ ابوالکلام کی رہنمائی کا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی آواز اور اس کا کوئی وزن ہے تو اس میں ابوالکلام کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ابوالکلام کی ذات تاریخ کی سچائی، فکر کی صداقت اور رائے کی اصابت کی ایک علامت ہے۔ ان کی کسی بات سے اختلاف کے بعد بھی ان کی رائے کے وزن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

بزرگوں، دانشوروں اور مفکروں کے جو اقوال ہمارے مطالعے میں آتے ہیں، جن سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں، وہ ان کی زندگی بھر کے مطالعے اور مشاہدے کا حاصل اور تجربات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے صرف مطالعہ اور تجربہ ہی کافی نہیں ہوتا، بلکہ ذہانت، ادبی ذوق اور تحقیقی صلاحیت کی اہمیت بھی ہوتی

ہے۔ کوئی قول صرف خوبصورت جملہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ پختہ فکر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک ملفوظ سچائی ہوتی ہے۔ اگرچہ سچائی اور حکمت کسی زبان ہی کے لباس اور لفظوں کے پیکر میں نمودار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی مذہب یا فلسفے کی اصطلاحات میں بیان کی جاتی ہے لیکن وہ کسی ایک مذہب یا فلسفے کی ملکیت یا کسی خاص قوم یا اس کے ادب کی میراث نہیں ہوتی۔ بلکہ دنیا کی تمام آلودگیوں سے پاک و منزہ حقیقت کے آسمان پر چمکتی ہے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور فلسفوں کے ماننے والوں کی نظریں اسے دیکھتی ہیں اور سب اپنے خزانۂ علم و فکر کا جوہر سمجھتے ہیں اور اس کی نفع بخشی اور حکمت آفرینی پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ ملفوظ سچائی زبان کا ایک جملہ ہوتی ہے یہی سچائی ہے جسے کوئی گیتا میں تلاش کرتا ہے، کوئی انجیل مقدس کی آیات میں ڈھونڈھتا ہے اور کوئی اسکے سراغ میں قرآن حکیم کے بصائرو حکم میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور یہی سچائی کبھی غالب کے دیوان میں ملتی ہے اور کبھی اقبال کا شعر اور آزاد کا قول بن جاتی ہے۔ اس سچائی کو ذہانت سیراب کرتی ہے۔ ذوق اس میں رنگ و لطافت پیدا کرتا ہے اور تخلیقی صلاحیت اسے تراشتی، خاص شکل اور حسن و نفاست بخشتی ہے، تب کوئی بات تاریخ کی سچائی، فکر کی ندرت، تہذیب کی شائستگی، خیال کی پاکیزگی زبان کی لطافت اور معنیٰ کی خوشبو میں بس کر قول کا درجہ حاصل کرتی ہے اور تبھی اسے وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی کے نام سے منسوب کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ قول فلاں کا ہے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ

> "مولانا کے اقوال گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ اور اس قران السعدین کا نتیجہ ہیں۔ ان کے اقوال تاریخ کی دائمی صداقتوں اور اخلاق و تہذیب کی ادبی اقدار کا آئینہ ہیں"۔

ابوالکلام کے جو اقوال آپ کے مطالعے میں آرہے ہیں، ان کا پس منظر یہی ہے۔ ان میں تاریخ کی سچائیاں ہیں، قوموں کے تجربات ہیں، مذہبی عقائد کی دل نشینی اور جاذبیت ہے، علوم و افکار کے نکتے ہیں، فنون کا ذوق ہے، ان میں مطالعے کی گہرائی و گیرائی اور ذہانت کی کارفرمائی ہے۔ ان میں ابوالکلام کی نظر کی رسائی، ذہن کی نکتہ رسی اور فکر کی بلندی اور ان کے ذوق و طبع کی نفاست اور خیال کی پاکیزگی کا اظہار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ زبان کی سادگی، لفظوں کے حسن، جملوں کی تراش، بیان کی رنگینی، نگارش کی شگفتگی اور اسلوب کی طرفگی نے

ملکر ان کے اقوال کو ضرب الامثال، تحریر کو ادب پارہ اور مضمون کو ادبِ عالیہ کے درجے پر پہنچادیا ہے۔ تاریخ، دانش مندی، ادب، تہذیب میں ہمیشہ زندہ رہنے والا ادب! مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھاہے:

"مولانا ابوالکلام حکیم و عارف ہوں یا نہ ہوں بہ ہر حال ان کی تحریروں میں کہیں کسی سے منقول، کہیں کسی اور طریقے سے نکتے حکمت و معرفت کے اچھے خاصے مل جاتے ہیں"۔

(سچی باتیں، صدق جدید، لکھنؤ، ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ا)

ابوالکلام آزاد کو اللہ تعالیٰ نے علم کی فضیلت، ذہنی دماغ کے کمال اور اخلاق وسیرت کے حسن سے نوازا تھا اور علم و عمل کے مختلف دائروں میں وطن اور قوم و ملت کی خدمات کی توفیق بخشی تھی۔ انہیں دینی و دنیاوی علوم اور معقولات و منقولات پر عبور حاصل تھا۔ وہ شریعت کے عالم باعمل، راہ طریقت کے سالک، سلوک و تصوف کے رمز آشنا اور صاحب حال شخصیت تھے۔ وہ ذہانت و فطانت اور ذہنی و دماغی کمالات میں نادر روزگار، تدبر کی علامت فراست کی مثال۔ اخلاق و سیرت کا مجسمہ اور تہذیب و شائستگی کا پیکر تھے۔ وہ فکر کے توازن عمل کے اعتدال، مزاج کے تحمل، طبع کی سلامتی، ذوق کی نفاست اور قلب کے اخلاص میں اپنی آپ مثال تھے۔ غرض کہ ابوالکلام کی ذات گرامی علم و عمل اور ذوق و سیرت کے ہر دائرے میں امتیاز، ہر جہت میں ایک شان اور ہر خوبی میں ایک آن کی مالک تھی۔

ابوالکلام علوم و معارف کی ایک غیر معمولی اور بلند پایہ شخصیت اور پاکیزہ سیرت کا ایک مرمریں پیکر تھے۔ وہ اخلاق و تہذیب کا ایک لائق پرستش مجسمہ اور ذہنی و دماغی محاسن اور فکر و فلسفہ کی ایک نادر روزگار ہستی تھے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں حسنِ عمل کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ وہ اپنے ظاہر شمائل سے لے کر باطنی کمالات تک حسن کا پرتو تھے۔ اگر کسی شخصیت میں ظاہر و باطن کی اتنی خوبیاں موجود ہوں تو اس سے دنیا کی عقیدت و احترام میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے۔

جس طرح سونا ریت سے اور ہیرے کان سے نکالے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مطالعہ و مشاہدہ کی ریت اور ذہانت کی کان سے افکار کا سونا اور اقوال کے جواہرات نکلتے ہیں۔ ابتداءً یہ

خام مال کی شکل میں ہوتا ہے۔ غور و فکر اس کے پوشیدہ جوہر کو تلاش کرتا ہے اور اسلوب تحریر کی ندرت کاری اسے کسی خاتم تحریر کا نگینہ بنا دیتی ہے۔ پھر یہی نگینہ کسی عارف و مفکر کے نادر قول کے طور پر شہرت پاتا ہے۔ لیکن فکر و معرفت کا یہ مقام ہر ادیب و مصنف اور شاعر کو نصیب نہیں ہو جاتا کہ اس کے بیان و تحریر سے عالم گیر صداقتوں کا عطر کشید کر لیا جائے اور اس کے بیان اور جملہ ہائے کلام کو اقوال زریں کا درجہ دیا جائے۔ اس کے لیے گہرے مشاہدے، وسیع مطالعے، تنقید و تجزیہ کی نگاہ، تخلیق کی صلاحیت، باریک بینی، ژرف نگاہی، ذہن کی رسائی، دماغ کی کاوش، غور و فکر و تدبر، نکتہ سنجی، مضمون آفرینی اور تحریر نگارش کی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اقوال کے مختلف و متعدد ماخذ ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم اقوال و حکمت اور جوامع الکلم کا سب سے بڑا ماخذ اور مصدر ہے کہ وہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ وہ تاریخ عالم کی صداقتوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ اس میں اقوام و امم کی عبرت آموز اور سبق آموز سرگزشتیں ہیں، عبرت و موعظت کے وقائع ہیں، بصائر و حکم سے معمور امثال ہیں۔ اس کی آیات میں معارف اور ایام و وقائع میں نظائر ہیں، جن میں فکر و تدبر کا ہر لمحہ انفس و آفاق کے سربستہ رازوں اور پوشیدہ حقائق و معانی سے آشنا کرتا ہے۔ اس کے نزول کو چودہ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ لیکن عالم اس پر نظر و تدبر میں مصروف ہے۔ سیکڑوں عظیم الشان زندگیاں اور ان کی بہترین ذہنی و دماغی صلاحیتیں اس کی تفسیر میں بسر ہو چکی ہیں۔ جن کے نتائج نے دنیا کو نئے علوم اور نئے افکار و حقائق سے آشنا کیا ہے۔

دوسری مذہبی کتابوں میں بھی، خواہ ان کی صداقت دستبرد زمانہ سے کتنی ہی مسخ ہو چکی ہو، ان کے صفحات میں حقائق و معارف کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

ہم اس مقام پر مولانا ابوالکلام آزاد کے چند اقوال کی طرف اشارہ کریں گے، جو اگرچہ ان کے اسلوب نگارش کی ندرت کاری کا بے مثال نمونہ ہیں۔ لیکن قرآن کے معارف و حکم اس کے لفظوں کے پردے سے جھانکتے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

”جھوٹ کا کارخانہ کتنا ہی مضبوط بنایا جائے، آخر اسے ٹوٹنا اور نابود ہونا ہے۔
دوام و ثبات حرفِ حق ہی کے لیے ہے“۔

ان جملوں پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحبِ قلم کے حافظے میں قرآن حکیم کی آیت "جاء الحق وزهق الباطل ۔ان الباطل کان زهوقا۔" موجود تھی۔ مولانا کے قلم سے معارف قرآنی کے یہ جملے اردو ادب میں شاہ کار بن گئے۔

بعض جگہوں پر تحریر کے خاتمے پر آیت کو اس طرح استعمال کیا ہے "گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔ چند تحریرات یا اقوال یہ ہیں:

(۱) دنیا میں ہر چیز مٹ سکتی ہے، پر حق و صداقت ہی ایک بیج ہے جو پامال نہیں ہو سکتا۔ والله سبحانه يقول: "انی لا اضیع عمل عامل من ذکر و انثی" (سورۂ آل عمران ۳:۱۹۵)

(۲) عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے اور ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے، مگر خود اپنی خبر نہیں۔ "و فی انفسکم افلا تبصرون۔" (سورہ الذاریات، ۵۱:۲۱)

(۳) انسان کا بھی یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے، اس کی رکھوالی کی جاتی ہے، جو بیکار ہو جاتا ہے، اسے چھانٹ دیا جاتا ہے۔ فاما الزبد فیذهب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (سورہ رعد، ۱۳:۱۷)

(۴) آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہو اور اس لیے باقی و قائم رہنے کا حق دار ہوا۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہو گا تو آخر کی جیت انصاف ہی کے حصے میں آئے گی۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالك یضرب الله الامثال" (سورہ رعد، ۱۳:۱۷)

کسی زبان و ادب کے مشاہیر ادب اور اربابِ فکر و دانش کے اقوال و بیانات کا ترجمہ بھی اگر مہارتِ فن سے کیا جائے تو ترجمہ کی زبان کے حسن، اس کی معنوی اہمیت اور علم و حکمت میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں۔ مولانا کی تحریرات میں تراجم کے ذریعے حکمت کے موتیوں اور دانش کے جواہرات کے اضافے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اب وہ تمام اقوال و امثال اردو ادب کا ناقابل فراموش سرمایہ ہیں۔

مولانا آزاد نے ان ہمہ قسم کے معاون و مصادر سے استفادہ کیا ہے اور اپنی نادر تحریرات کے ذریعے اردو زبان کے دامن اور ادب کے خزانے کو معارف و حکم کے رنگارنگ پھولوں سے معمور و مزین، اوراس کی فضاؤں کو نوع بہ نوع شمیم جاں فزا سے معطر کر دیا ہے۔

ابوالکلام کا عہد عظیم شخصیتوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ ہر علم و فن کے دائرے میں بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ ان میں کون تھا جس نے قرآن نہ پڑھا ہو، حدیث و آثار جس کی نظر سے نہ گزرے ہوں، تاریخ جس نے نہ پڑھی ہو، شعر وادب سے کس کا ذوق نا آشنا تھا، صاحب طرز ادیبوں اور انشا پردازوں کی اس عہد میں کمی نہ تھی، محیر العقول حافظے اور حیرت انگیز طلاقت لسانی کی مثالیں بھی ناپید نہ تھیں بلکہ یہ حقیقت تسلیم کر لینے میں ابوالکلام کی عقیدت اور محبت مانع نہیں ہو سکتی کہ بعض علوم و فنون اور شعر وادب کے دائروں میں ان سے بڑی شخصیتیں موجود تھیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں ابوالکلام کوئی نہ تھا!

ابوالکلام نے قرآن کے سمندر سے حقیقت و معرفت کے جو موتی نکالے تھے ان تک کسی کے ذوق و ہمت کی رسائی نہ ہوئی تھی۔ آثار و احادیث کے بصائر و حکم کسی کی سمجھ میں نہ آئے تھے، تاریخ کے مطالعے سے جو کلیات و جزئیات ابوالکلام نے اخذ کیے تھے ان سے ہر کوئی قاصر رہا تھا۔ علوم و فنون کے مطالعے نے جس طرح ان کے دماغ کو روشن کیا تھا، اس میں ہر کسی کا حصہ نہ تھا، جو بصیرت و دانش ان کے حصے میں آئی تھی، اسکی توفیق کسی کو نہ ہوئی تھی۔ اسلاف کے تذکار و حکایات اور ان کے افکار و ملفوظات بہتوں نے پڑھے تھے، لیکن ان سے عبرت و موعظت کے پھول چن لینا ابوالکلام کا نصیب تھا۔ شعر وادب کے مطالعے سے کوئی صاحبِ ذوق محروم نہ رہا تھا، لیکن اشعار کے مطالعے سے کسی اصول اور نکتہ حقیقت کو اخذ کرنا، اسے اپنے اسلوب کے سانچے میں ڈھالنا اور ایک نادر فکر کے طور پر پیش کرنا اور اس شعر سے اُس پر اس طرح استدلال کرنا کہ معلوم ہو گویا یہ شعر اسی محل کے لیے کہا گیا ہے! یہ کمال ابوالکلام کا تھا۔

ابوالکلام کے اقوال و افکار کا مطالعہ کیجیے! صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ماخذ قرآن کی کوئی آیۂ حکمت، آثار و حدیث کا کوئی کلمۂ جامعہ، کسی علم و فن سے ماخوذ کوئی نکتۂ حقیقت یا کسی عالم و بزرگ کے تذکرۂ و سیرت کے مطالعے نے حقیقت و معرفت کا دروازہ

کھول دیا ہے اور زبان کی سلاست، بیان کی فصاحت، تحریر کی لطافت، ذوق کی پاکیزگی اور طبع کی سلامتی نے اسے ایک ادب پارے کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو ابوالکلام کا جسد فانی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب جب تک زندگی کی سرحد کو ہم عبور نہ کرلیں، ہم انھیں دیکھ نہیں سکتے، لیکن ان کی فکر و سیرت کے لیے موت نہیں اور جب تک فکر و سیرت زندہ ہے، ان کا فیضان جاری رہے گا اور ہم ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

۲۱ر جون ۲۰۰۱ء

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری)
ڈائر کٹر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان
۱/۹ علیگڑھ کالونی۔ کراچی۔

خدابخش لائبریری کی تازہ ترین اہم مطبوعات

* فیض نامہ/ ڈاکٹر ایوب مرزا — ۲۰۰۲ء — ۶۴۰ص — -/۳۰۰
* معاصر کا توضیحی اشاریہ/ ڈاکٹر محمد نور اسلام — ۲۰۰۲ء — ۲۱۸ص — -/۱۰۰
* دارالمصنفین کی تاریخی خدمات/ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی — ۲۰۰۲ء — ۳۹۶ص — -/۲۰۰
* ناول کا فن اور نظریہ/ ڈاکٹر محمد یٰسین — ۲۰۰۲ء — ۲۲۴ص — -/۱۰۰
* مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری — ۲۰۰۲ء — ۹۴ص — -/۶۰
* مقالات خدابخش سمینار ۲۰۰۱ — ۲۰۰۲ء — ۲۴۲ص — -/۱۰۰
* مولوی خدابخش خاں: حیات اور کارنامے — ۲۰۰۱ء — ۵۶۰ص — -/۲۵۰
* مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نابغۂ روزگار شخصیت/ محمد اسحاق بھٹی — ۲۰۰۱ء — ۱۳۶ص — -/۶۰
* دیوانِ آہ: مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی کے اردو فارسی کلام کا مجموعہ مع ضمیمہ کلام آرزو و آبرو/ ابوسلمان شاہجہانپوری — ۲۰۰۱ء — ۱۸۴ص — -/۵۰
* ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں/ سید سلیمان ندوی — ۲۰۰۱ء — ۸۲ص — -/۵۰
* حافظ: شخص اور شاعر/ پروفیسر کبیر احمد جائسی — ۲۰۰۱ء — ۱۵۰ص — -/۶۰
* تاریخ مگدھ: صوبہ بہار کی مکمل تاریخ ۶۴۲ ق م-۱۹۴۳ء/ فصیح الدین بلخی عظیم آبادی — ۲۰۰۱ء — ۴۰۶ص — -/۲۵۰
* سعداللہ مسیح اور فارسی رامائن مسیحی/ ابوسعادت جلیلی — ۲۰۰۱ء — ۲۷۴ص — -/۲۲۵
* علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ/ الیاس الاعظمی — ۲۰۰۱ء — ۸۸ص — -/۵۰
* تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں/ ڈاکٹر عبدالمغنی — ۲۰۰۱ء — ۴۲ص — -/۳۰
* خاندان شریفی: شخصیات و معمولات مطب/ حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی — ۲۰۰۱ء — ۳۴۲ص — -/۱۵۰

****

حصہ اوّل

مذہبیات

مذہبیات

(۱)

ایمان و عقائد:

ایمان:

سید الطائفہ [حضرت جنید] بغدادی سے کسی نے پوچھا: ایمان کی تعریف کیا ہے؟
فرمایا "اما عند کم فالاعتقاد باللہ و رسولہٖ و اما عندنا فالفنافی اللہ ورسولہ"
تمہارے نزدیک تو تعریف یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر اعتقاد رکھا جائے اور ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں فنا ہو جائے۔

(خطبات جمعات و عیدین، ص،۴۱)

ایمان اور انسان کا خوف:

دنیا میں متضاد سے متضاد اجزاء باہم جمع ہو سکتے ہیں۔ آگ اور پانی ممکن ہے ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ شیر اور بکری ہو سکتا ہے ایک گھاٹ سے پانی پی لیں لیکن "خدا کا ایمان اور انسان کا خوف" یہ دو چیزیں ایسی متضاد ہیں جو کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

(رسول رحمت، ص ۶۱)

ایمان:

ایمان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور قرآن اور صاحب قرآن پر ایمان لائے اور عمل سے مقصود وہ اعمال ہیں جنہیں قرآن نے اعمال صالحہ قرار دیا ہے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۸۲)

ایمان اور اظہار حق:

اظہار حق اور امر بالمعروف نتیجے کے خیال سے بے پرواہے وہ ایک فرض ایمان اور

محض تعبد الٰہی ہے ،اور وقت کے بدلنے اور لوگوں کے منہ پھیر لینے سے اس کا حکم نہیں پھر سکتا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد / ۲، بدر الحسن صفحہ ۳۔۳۰۲)

ایمان اور عمل کی طاقت:

اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔

(خطبات آزاد، دہلی صفحہ ۴۵)

سب سے پہلا اور بہتر رفیق (مولانا دریابادی کے نام):

آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لیے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے، اس سے طبیعت نہایت درجے مسرور ہوئی۔ کاش! اس کا جلد ظہور ہو۔ ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۰۵)

اعتقاد اور عمل کی کمزوری:

اگر ہمارے اندر اعتقاد اور عمل کی ایک ادنی سی کمزوری اور خامی بھی پیدا ہوگئی۔ تو ہم خود آپ ہی اپنے قاتل ہوں گے اور ہم سے بڑھ کر دنیا میں اب تک مٹ جانے والی کوئی چیز بھی نہیں ملے گی۔

(قول فیصل، ص ۹۳)

عقائد و اعمال کی تین حالتیں (ایمان، کفر اور نفاق)

یہ جو قرآن نے انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں قرار دیں: ایمان، کفر، نفاق۔۔ تو فی الحقیقت عالم ہستی کے تمام گوشوں میں اصلاً تین ہی حالتیں پائی جاتی ہیں:

یا تو تکوین کی حالت ہوگی یا افساد کی حالت ہوگی یا پھر دونوں کی درمیانی حالت! خود اپنے وجود ہی کو دیکھ لو! یا زندگی ہے یا موت ہے یا بیماری!

بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں، دونوں کے بین بین ہے۔ لیکن رخ اس کا موت ہی کی طرف ہے۔ قلب و روح کا بھی یہی حال

ہوا۔ ایمان زندگی ہے کفر موت ہے اور نفاق بیماری!

(ترجمان القرآن (جلد سوم) ص ۴۵۵)

موروثی عقائد اور غلط اندیشیوں کی صورت گری:

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم اس راہ کا سراغ نہیں پا سکتے لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی اور نہ کھوئی ہوئی تھی یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کر دیا تھا۔

دردشت آرزو نہ بود بیم دام و دو
راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

اب معلوم ہوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے، وہ مذہب کہاں تھا؟ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورت گری تھی

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ است

(غبار خاطر، ص ۶۷-۶۶)

غرورِ عقائد کا فتنہ:

آج یہ حال ہے کہ اسلام و ایمان کا سارا دارومدار محض چند جزئیاتِ اختلافیہ کی محافظت پر آکر ٹھہر گیا ہے اور صرف انہی کے غرور و پندار میں ہر شخص مست رہتا ہے۔ عمل کی درستگی اور تقویٰ و طہارت کی اہمیت و تقدیم یک قلم فراموش کر دی گئی ہے، اور قریب ہے کہ اسلام کے ارکان و شرائط سے عمل صالح کا رکن اس طرح معدوم ہو جائے گویا وہ کوئی ضروری چیز تھا ہی نہیں۔ ساری جستجو اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کے عقائد کیسے ہیں؟ یعنی چند مزعومہ جزئیاتِ متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے، اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے! اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں انفاق جان و مال کا کیا حال ہے؟ تقویٰ و طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھرپور؟ معاملات میں کیا حال ہے؟

لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ، رفیق بھائی، وفادار شوہر، اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے، یا ایک بے رحم وجود، بے حس پتھر اور موذی و مہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اُس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر چند اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے، تو پھر ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی روئے زمین پر کوئی نہیں! یہی گمراہی یہود کی تھی کہ صرف اسرائیلیت کے غرور میں بدمست رہتے تھے۔ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ یہ غرورِ عقائد کا فتنہ بہت ہی بڑا فتنہ ہے اور آج مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی اس سے گھلی جا رہی ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(تذکرہ، صفحہ ۷۳۔۷۲)

جزئیات مزعومۂ عقائد کا غرورِ باطل اور عملِ صالح کا نسیان و اعراض:

افسوس جزئیاتِ مزعومۂ عقائد کے غرورِ باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عملِ صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دارومدار چند مزعومہ عقائد پر آ کر رہ گیا۔ ایک شخص صرف اس غرور میں کہ میں الف سے لیکر ی تک ٹھیک عقائد نسفی کا مجسمہ ہوں، تمام مسلمانوں کو حقیر و گمراہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عملِ صالح اور ایثار و محبت فی اللہ کوئی شے نہیں۔ ایک شخص تقویٰ و طہارت میں کتنا ہی اصلح ہو، لیکن اگر کسی ایک جزئی و ضمنی عقیدہ میں بھی مخالف ہوا، تو اُس کی ساری عمر کی کمائی رائگاں گئی، اور باوجود عمر بھر کے ایمان و عملِ صالح کے کافر کا کافر ہی رہا۔ جس کلمہ کے ایک بار اقرار کر لینے سے ابو سفیان اعدیٰ عدوے اسلام اور وحشی قاتلِ حمزہ کا خون حرام ہو گیا تھا! اور اگر ابو جہل بھی اقرار کر لیتا تو اس کی ساری عمر کا کفر و طغیان محو ہو جاتا، آج ساری عمر اُس کے ایمان و عمل میں بسر کر دیجیے لیکن پھر بھی مومنوں کے گروہ میں شمار ہونے کا حق حاصل نہیں کر سکتے! افسوس تیرہ سو برس گذر گئے مگر کفر و ایمان کی گتھی آج تک نہ سلجھی:

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں میرود

اصل یہ ہے کہ اسلام نے بابِ عقائد میں صرف بنیاد کی چند صاف صاف اور موٹی موٹی باتیں بتلادی تھیں، اور اُس کے بعد سارادارومدار عمل صالح پر رکھا تھا۔ بنی الاسلام علی خمس الخ۔ اور مَنْ آمن با للہ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وعَمِلَ صَالِحا فَلَا خَوف علیھم و لا ھم یحزنون۔ ہر طرح کی فضیلت و مزیت کا معیار صرف تقویٰ اور اس کے مراتب بَعْضُھَا عَلٰی بعض تھے اور بس کہ ان اکرمَکُمْ عِند اللہ اَتقَاکُم۔ جو شخص شہادتین کا اقرار کرتا تھا بجرد اقرار مسلمانوں میں داخل ہو جاتا تھا اور پھر مسلمانوں میں سے جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں سب سے زیادہ ایثار جان و مال کرتا تھا، وہی سب سے افضل و اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ صحابۂ کرام کا پورا عہد گذر گیا، مگر کسی شخص کو ایک لمحے کے لیے اس کا وہم بھی نہیں گزرا کہ اسلام و ایمان اور فضیلت و بزرگی کا معیار عملِ صالح اور تقویٰ و طہارت کے سوا اور بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی روایتیں جو تم صحاح میں پڑھتے ہو: و کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایرون شیئامن الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ۔ تو ان کا بھی یہی مطلب ہے کہ بنیاد ساری باتوں کی صرف عملی زندگی تھی۔ عقائد کے باب میں نہ تو کوئی اختلاف تھا، اور نہ فتنہ تفریق تمذہب کی بنیاد پڑی تھی،

لیلٰی و مجنوں بہم می بودہ اند
پیش ازیں خوش روزگارے بودہ است

(تذکرہ، صفحہ ۷۳۔۷۰)

مذہب:

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دیدے گا، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہیں باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے، جنہیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے نہیں لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہیئں جنہیں ثابت نہیں کر سکتے۔ لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

(غبار خاطر (لاہور)، صفحہ ٦٤)

مذہب کی قسمیں:

☆ ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں مانتے رہیے۔

☆ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکرے میں ایک شاہراہ عام بن گئی ہے۔ سب اسی پر چلتے ہیں۔ آپ بھی چلتے رہیے۔

☆ ایک مردم شاری کا مذہب ہے کہ مردم شاری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔

☆ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے اُسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے۔

☆ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے، اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا ایں جاست

(غبار خاطر، ص ٦٧)

مذہب کی حقیقت اور غلط اندیشیوں کی صورت گری:

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے، اور اگر قدم اُسی پر رک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا، مگر میں رکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام و خیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی گئی ہے، اور اگر سکون و طمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا

تھا، وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی، وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی:

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ
کما یتداوی شارب الخمر بالخمر!

(غبار خاطر، ص ۶۷-۶۶)

علم اور مذہب کی نزاع:

اسی مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدعیان علم کی خامکاریوں، اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:

عباراتنا شتیٰ و حسنك واحد
و کل الیٰ ذاك الجمال یشیر

(غبار خاطر صفحہ ۶۸،-۶۷)

اسلام جامع حسنات دنیا و آخرت:

اسلام خود اپنے بیان کے مطابق ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وّ فی الاٰخرۃِ حسنة دین و دنیا کی اصلاح کے لیے آیا تھا اور اس لیے دونوں جہاں کی برکات اس کے ساتھ تھیں۔ پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کے خزانۂ ہدایت میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ منصف خدمت انسانی کی انجام دہی ہے متقصر رہا جس کا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے کارنامہ ہائے سیاسیہ اور طرق اصلاح حکومت دنیویہ سے آج واقفیت حاصل کرے۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۱۸۴)

مذہب اور زندگی کی ناگواریاں:

علم (سائنس) عالم محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماوراء محسوسات کی خبر دیتا ہے دونوں میں دائروں کا تعدد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماوراء ہے

ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں!

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرمِ نگاہِ دیدۂ صورت پرست ماست!

مذہب کی رہنمائی:

بہر حال زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (Moral Values) کا یقین دلاتا ہے، اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے۔ جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیے:

جلوۂ کاروانِ مانیست بہ نالۂ جرس
عشق تو راہ می برد، شوقِ تو زادمی دہد

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا!

(غبار خاطر، لاہور، ص ۶۸)

اسلام اور دین ابراہیمی:

اسلام در حقیقت دین ابراہیمی کی حقیقت کی تکمیل تھا۔ اس لیے وہ ابتدا ہی سے اس حقیقت گم شدہ کی تجدید و احیاء میں مصروف ہو گیا، جس کا قالب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں نے تیار کیا تھا۔ اسلام کا مجموعہ عقائد و عبادات صرف توحید نماز، روزہ زکوۃ اور حج سے مرکب ہے، لیکن ان تمام ارکان میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس سے اس تمام مجموعے کی ہیئت ترکیبی مکمل ہوتی ہے اور یہ تمام ارکان اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔

(رسولِ رحمت، ص ۶۰۷)

اسلام اور اسلامی نظام حیات:

اسلام سے پہلے جن شرائع کا ظہور ہوا، اُن سب نے اپنی تمام توجہ محض مفاسد کے دفع و منع میں محدود رکھی، وسائل و مقدماتِ مفاسد سے چنداں تعرض نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ

تھا کہ اُن کا عہد ابتدائی عہد تھا اور سلسلہ ارتقاء مذہب کی وہ ابتدائی کڑیاں تھیں، جو بتدریج حسبِ استعداد اُمم ظاہر ہوتی رہیں اُس وقت اقوام کی استعداد یہاں تک نہیں پہنچی تھی کہ منع وسائل کے نازک و دقیق احکام کی متحمل ہو سکیں۔ اُن کی کوتاہی نظر و حداثت فکر کا تو یہ حال تھا کہ صریح بت پرستی سے بچنے کا صاف وواضح حکم بھی بارِ خاطر ہو تا تھا۔ مصر سے نکلتے ہی بنو اسرائیل نے فرمائش کردی تھی "اجعل لنا الھاً کما لھُم آلِھة،قالَ انکم قوم تجھلون" لیکن جب وہ وقت آگیا کہ "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممتُ علیکم نِعمتی ورضیتُ لکم الاسلام دینا" اور اسلام کا ظہور ہوا، تو ضروری ہوا کہ آیندہ کے لیے مفاسد کا قطعی سدباب کردیا جائے اور ان تمام سوراخوں کو بند کردیا جائے جہاں جہاں سے شر و فساد کو اُبھرنے کے لیے راہیں ملتی رہی ہیں۔

(افادات آزاد ص ۷۸)

اسلام کا نظام شرعی:

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفہ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر۔ جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قوام ہستی کی زنجیر فطرۃ کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت ونظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہوجائیں، یا مرکز کی اطاعت وانقیاد سے باہر ہوجائیں، تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہوجائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم اور باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ

حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا کہ "الحقیقۃ کالکرۃ" اور صاحب فتوحات نے کہا کہ "دائرہ قاب قوسین" ہے۔

قانون مرکزیہ کا بلند ترین نظارہ:

یہ قانون مرکزیہ و دوائر نظام ہستی کے ہر جز اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے ستاروں کی یہ گنجان آبادی کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم، کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیہ پر۔ متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں، ہر دائرہ کا نقطہ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے: ذلك تقدير العزيز العليم۔ خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف و دوران کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دیدیا ہے۔ وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ سب بحکم وله اسلم من فی السماوات والارض (۲:۸۳) اور ان الله یسجدله من فی السماوات و من فی الارض و الشمس والقمر والنجوم (۲۲:۱۹) خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں: لاالشمس ینبغی لها ان تدرك القمر ولا اللیل سابق النهار، و کل فی فلك یسبحون (۳۶:۴۱)

دعوت فکر و تدبر:

قانون مرکزیہ کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا، اب اس کے بعد جس قدر نیچے اُترتے آئیں گے، اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لیکر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو۔ اس کی ایک مجتمعہ وحدۃ کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں۔ لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہو گئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی

ضرورت نہیں تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضا سے مرکب ہے ؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے۔ جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ۔ لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا "اذا صلحت ،صلحت کلھا" واذا فسدت، فسدت کلھا"

انبیائے کرام۔ نوع انسانی کا مرکز سعادت:

اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوع انسانی کی سعادت وارتقاء کے لیے قانون اسلام اُسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانون حیات بنایا، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو، بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزء نظر آئے، جیسے زنجیر کی ایک کڑی، پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک اسی قانون مرکزیہ پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام واشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت وافراد کا جسمانی ومعنوی بقا بھی قانون مرکزیہ پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز ومحور سورج کا وجود ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت وانقیاد بقاء وحیات کے لیے ناگزیر ٹھہری: وما ارسلنا من رسول الالیطاع باذن الله (۶۸:۴) دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اسی لیے فرمایا: فلاو ربك لا یومنون حتیٰ یحكموك فیما شجر بینهم ،ثم لا بجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیما (۶۹:۴) اور لقد كان لكم فی رسول الله اسوة حسنه۔ پھر قوم وملت کی بقا کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے: ان الله لا یغفران یشرك به ویغفر ما دون ذلك لمن یشاء (۵۲:۴) عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جس کے ترک کردینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے۔ " فمن اقامها اقام الدین و من تركها فقد هدم الدین" اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ "كان اصحاب رسول الله صلعم لا یرون شئیا من الاعمال تركه كفر غیر

الصلوٰۃ" (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا: جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس۔ "قیاما للناس" پر غور کرو اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا، اس لیے تمام دائرہ کا رخ بھی اسی طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں، لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے: وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره (۲:۱۴۵)

خلفائے کرام جماعتی زندگی کا مرکزی وجود:

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کے لیے مراکز قرار پائے، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہذا وہ مرکز بھی قرار دیدیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت، اس کی حرکت پر حرکت، اس کے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک اس کی دعوۃ پر انفاق جان و مال، ہر مسلمان کے لیے فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاھلیۃ کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس قومی مرکز کا نام "خلیفہ" اور امام ہے، اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے۔ یعنی کتاب و سنت کے مطابق اُس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی:

يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم فان تنازعتم فى شى فردوه الى الله والرسول ، ان كنتم تومنون بالله واليوم الآخر ـ ذلك خير واحسن تاويلا (٤:٦٣)	مسلمانوں اطاعت کرو اللہ کی، اسکے رسول کی اور تم میں جو اولوالامر ہو، اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ۔

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولوالامر ہو، اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے

مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولوالامر، تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ "اولوالامر" سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظام امت قائم رکھنے والا اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۲۲۔۱۹)

اسلام کا نظام عمل:

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جسمیں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے:

قال صلی اللہ علیہ وسلم : "انا امرکم بخمس، اللہ امرنی بھن : الجماعۃ ، والسمع، والطاعہ ، والھجرۃ، والجھاد ،فی سبیل اللہ۔ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر، فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھومن جثی جھنم۔ قالو ا یا رسول اللہ وان صام وصلی؟ قال وان صلی وصام و زعم انہ مسلم " اخرجہ احمد والحاکم من حدیث " الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین ،قال ابن کثیر ھذا حدیث حسن ولہ الشواھد۔

یعنی فرمایا۔ میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعۃ، ہجرۃ، اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا، اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہو گا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں۔ اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

پانچ باتیں:

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں:

۱۔ الجماعت:

پہلی چیز "جماعت" ہے۔ یعنی تمام اُمت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ جماعت سے الگ ہو کر رہنے گویا

ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

"جماعت" سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد "ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔

"اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف" کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے۔ "اتحاد" صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن "ائتلاف" سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح ومناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت وقوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے، وہی جگہ اُسے ملی ہو۔ اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے، جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے، اور عمرو کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دیا جائے۔

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت وخصلت اور استعداد وصلاحیت باہم دگر میل نہیں کھا سکتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ، لیکن تیل اور پانی

کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں۔ باہم ملکر ایک جان نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اسلیے پیدا کیا ہے کہ باہم دگر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں۔ اسی طرح افراد انسانی کو بھی اس لیے پیدا کیا تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ "جماعت" ایک مرتب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک شئ ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پاسکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر ٹکڑہ اپنے صحیح و مناسب ٹکرہ کے ساتھ ملکر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو، یہ نگینہ اسی انگشتری کے لیے تھا!

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں، نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے، اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد، مؤتلف، ممزوج، اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک "امام" کا وجود ناگزیر ہوا، اور اسی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کرلیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کردینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے۔ اور پھر ہر ملک، ہر آبادی، ہر گروہ میں اس کے ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں۔ حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کرلیا جائے۔ "اذا کان ثلاثۃ فی سفر، فلیؤ مروا احدھم" (صفحہ ۳۱۔۲۹)

اسلام کی زبان میں "جماعت" سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔انبوہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔

جماعت کے جن اوصاف وخواص کااوپر ذکر کیا گیا،وہ تمام تر قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن شواہد کی تفطیل کا یہ موقعہ نہیں۔

۲—السمع:

دوسری چیز "السمع" ہے۔یعنی امام جو احکام دے، اس کو سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔"سمع" کے لفظ میں قبولیت احکام وطلب تعلیم،دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

۳—الطاعت:

تیسری چیز "طاعت" ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت وفرماں برداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کردینا اور اس کے ہر حکم کی بلاچون وچرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ "انما الطاعة فی المعروف"

٤—الھجرت:

چوتھی بات ہجرہ ہے۔ ہجرۃ ھجر سے ہے جس کے معنی ترک کردینے اور چھوڑ دینے کے ہیں" الھجر و الھجران مفارقته الانسان غیره ، اما بالبدن أو باللسان أو بالقلب۔ والمھاجره مصارمة الغیر و متارکة"(۵۵۸) اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت وصداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنی دنیوی محبوبات ومالوفات ترک کردے۔ مثلاً دولت کو، آرام وراحت کو، عزیزواقرباء کے قرب کو، وطن ومکان کو، تو اس کا نام " ھجرۃ الی اللہ اور ذھاب الی اللہ" ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیرووں کو، قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی۔ (صفحہ ۳۳)

"ہجرت کا لفظ کس قدر تمہارے لیے نا آشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اُس عہد جہل ووحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کردیا تھا، اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی وتمدنی زندگی تک کو قربان کردیتا تھا۔ لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی وتمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلارہی ہیں

وہ ”ہجرت“ کی حقیقت سے کب خالی ہیں؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ”ہجرت“ سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اھل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ، علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کمیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گذرے اس نے پالی ہو؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیر انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے، اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش، اھل و عیال کی محبت، خویش و یگانہ کی الفت، اور ملک و وطن کی دامنگیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے، تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے، اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرہ ارضی کی پیٹھ پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، اُن سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولۂ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا؟ کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں، دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے، جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویہ و اشیاء کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے، اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارا نہ کر لیتے، تو اشیاء کی تحقیق کیونکر ہوتی؟ پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتی؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارت کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں؟ نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا، تو آج دنیا کا نصف تمدن ناپید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی

سر بفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت اُن کے گھروں میں کھینچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں، اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں، تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اُسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے، تو تم اس کا انکار کردو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سیکڑوں انسان اپنا گھربار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں، لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کشش ثقل" کا قانون دریافت کرلے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے۔ لیکن اگر تم عزم وطلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اُس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھربار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے؟

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد "کالونیل سسٹم" کو یقین کرتا ہے۔ یعنی نو آبادیوں کے اصول کو، اور اس کا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ و قتال میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نو آبادیوں کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ ترک وطن کر کے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا، اور قومی دولت و طاقت کو بڑھانے کے لیے دنیا میں دور دور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو کہ یہ وہی "ہجرت" اور ترک وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور "الجماعة؟ والسمع، و الطاعة والهجرة" پر دنیا عمل کر رہی ہے یا نہیں؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے (صفحہ ۳۸۔۳۶)

۵۔ الجہاد:

پانچویں چیز "جهاد فی سبیل الله" ہے۔ "جہاد" جہد سے ہے جس کے معنی "استفراغ الوسع فی مدافعة العدو ظاهراً و باطناً" ہیں (مفردات راغب) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کے دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے۔ مال سے بھی ہوتی ہے۔ جان سے بھی ہوتی ہے۔

جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے" وجاھدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السنتکم"

(رواہ ابوداؤد، واحمد، ونسائی، وابن حبان، عن انس [ص ۳۳])

"جہاد" کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان ومال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان ،بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاؤ قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع البقاء (Struggle for existence) اور انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح و امثل کے لیے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو، اور فطرۃ کے قتل و غارت کا افسانہ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اُسی حقیقت کو قرآن واسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے، اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے؟ پس دنیا میں اُسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق وہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد واعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ بنکر مٹادینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں: لیظھرہ علی الدین کلہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارتگری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں، اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں۔ اس کو تو تم گوارا کرلو، لیکن اگر اسلام کہے کہ "ان الارض للله ولرسولہ" خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر وضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے، تو تم اس کو وحشت اور خوفناکی کہو؟

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء و قیام کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے

مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی، تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے" مگر کوئی چیز بھی بغیر جماعت، اطاعت، ہجرۃ، اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب انہیں پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔ (صفحہ ۳۴۔۳۳)

الحاصل:

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت تعلیم، اطاعت، ہجرت، اور جہاد، دنیا کی وہ عالمگیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے انکا اقرار کیا ہے، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے، اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے، ان سے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی۔ اگر کرے۔ تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۳۵)

مسلمانانِ ہند اور نظام جماعت:

مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے، اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اُس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں، اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں۔ کمیٹیاں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں "بھیڑ" اور "انبوہ" کا حکم رکھتی ہیں۔ "جماعت" کا حکم نہیں رکھتیں۔ "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے جب کوئی تماشہ

ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم ومرتب صفیں ایک مقصد ایک جہت، ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کردیے ہیں وہاں اُن کے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے۔ افراد واشخاص کوئی شے نہیں جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کردیتی ہے تو گواس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہیں شخصی اعمال وطاعات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سودمند نہیں ہوسکتیں، اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن وسنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کردیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

شخصی اعمال کی اصلاح ودرستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے؟

کتاب وسنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں:

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم وعمل مسلمان پر جمع ہو جائیں، اور وہ ان کا امام ہو۔

وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان وصداقت کے ساتھ قبول کریں۔

قرآن وسنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، ان کی بلا چون وچرا تعمیل و اطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گونگی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو۔ سب کے دماغ بیکار ہو جائیں۔ صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں!

اگر ایسا نہیں ہے، تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے، مگر نہ تو "جماعت" ہے نہ "امت" نہ "قوم" نہ "اجتماع"۔ اینٹیں ہیں مگر

دیوار نہیں۔ کنگر ہیں مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کردی جاسکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار۔

کسی گذشتہ فصل میں بہ ضمن شرح حدیث حارث اشعری "جماعت" کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔اس موقعہ پر وہ پیش نظر رہے۔

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کی تمام گذشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کردی۔ حتی کہ سچ مچ وہ وقت آگیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے: فقد جاء اشراطها۔فانی لهم اذجاء تهم ذکر اهم ؟(۲۱:۴۷)اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا۔سچے کام کے کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے، مگر جب کبھی کیا جائے سچائی ہے۔اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی، معصیت اور ہلاکی ہے۔ لیکن جب کبھی کر دیا جائے، سچائی اور نیکی ہے، اور اُس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سن پاتے ہو، اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو، اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اُٹھتا ہے، یکا یک اعتقاد اور عمل، دونوں تمہیں یاد آجاتے ہیں۔حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے۔نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑجانے پر موقوف ہے۔ تمہاری مصیبت دائمی، تمہارا ماتم ہمیشگی کا، تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا، اور تمہاری نحوست چوبیس گھنٹے تمہاری ساتھی ہے۔اور ٹھیک اُسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سایے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے۔اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

تم وقت پر سامنے آجانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روز نئے روگ لگتے رہیں گے۔ خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا۔بس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ "ہندوستان کے مسلمانوں" کو مسلمان بنا

چاہیے، اور قوم و فرد، دونوں اعتبار سے ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے" اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے۔ ایمان کی گم گشتگی اور محرومی کا ہے:

درازی شب و بیداری من ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست!

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے؟ اگر آج مسلمانوں میں ان کے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے، تو ان میں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا۔ کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کاربند ہو جاتے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اُسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے۔ ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دہنے بلاتا ہے۔ کوئی بائیں۔ کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، یہ مہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے، جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر، ٹھیک ٹھیک منطبق کرے، اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتویٰ شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اس کا اہل ہے۔ نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پا سکتا ہے، اسکو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں۔ نہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو

جا سکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اسکی طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی۔ وہ ٹرین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے، مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے!

"جذبات" اُسی وقت کام دے سکتے ہیں، جب اُن کو مرتب کرنے اور ان پر حکم و قضاء کے لیے "ادراک" اور "دماغ" بھی موجود ہو۔ وذلك من عمل النبوة ، ولكن لا يعقلها الا العالمون ۔

بہر حال اس وقت، اور ہمیشہ سے، اور ہمیشہ کے لیے، "راہ عمل" بھی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کرلیں۔ اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات واعمال موقوف ہیں۔

تمام مسلمانوں کو اُن ہمدردان ملت کا شکر گذار ہونا چاہیے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اس کی شاخوں کے قیام کا سروسامان کیا۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام مسلمانوں کو نظام جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی۔ ایجی ٹیشن جاری رکھے گی۔ تبلیغ واشاعت کریگی۔ لیکن نہ تو وہ قوم کو سنبھال سکتی ہے، نہ کمیٹیوں سے "جماعت" پیدا ہو سکتی ہے، نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کے لیے، اپنے قیام و تکمیل کے لیے، دفع تفرقہ وانتشار کے لیے، اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کے لیے ایک بالاتر قوت حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اس کی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکھے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر واجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالت پر اصول واحکام شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک جزئیہ

حوادث و واقعات پر پوری کاردانی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا، اُمت و شرع کے اصولی مصالح و مقاصد اس کے سامنے ہوں گے۔ کسی ایک گوشے ہی میں ایسا مستغرق نہ ہو جائے گا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پرواہو جاے:

حفظت شيئاً و غابت عنك اشياء !

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعمال مہمہ اُمت کی راہ میں منہاج نبوت پر اس کا قدم استوار ہو گا، اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت، ہر تغیر، ہر حالت، ہر جماعت کے لیے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکے گا۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، ص ۱۱-۲۰۶)

قوم کی زندگی کی بنیاد:

جو قوم خود اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو اس کو محض دستوری تحفظات نہیں بچا سکتے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے قانون تمہیں محفوظ نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے آپ اپنے پاؤں کی نسوں کو مضبوط کرو۔

مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ ہے۔ اگر نو کروڑ کے بجائے مسلمان نو لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دلوں میں یہ خیال ہوتا کہ وہ مرنے کے لیے نہیں زندہ رہنے کے لیے ہیں تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔ میری جگہ کمزوری اور تذبذب کی نہیں ہے بلکہ یقین اور ایمان کی ہے۔ تم نو کروڑ ہوتے ہوئے یہ خیال کرتے ہو کہ فنا ہو جاؤ گے، مٹ جاؤ گے تو اس کا کیا علاج؟ نو کروڑ لاشوں کو کوئی تحفظ اور دستور نہیں بچا سکتا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ انگریز بہادر بچا سکتا ہے تو وہ بھی نہیں بچا سکتا اور اگر نہیں تو جب وہ اپنا بوریا بستر باندھے جیسے کہ اب باندھ چکا ہے تو اس کو کوٹ سے پکڑنا اور روک لینا۔

دنیا میں صرف تعداد ہی نہیں بلکہ دوسری چیزیں بھی کام آتی ہیں۔ جو میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لیے صرف ایک فرض رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولھا دہک رہا ہے۔ اس میں لکڑیاں ڈال دو۔ میں کوئی ایسا سوال اٹھانا نہیں چاہتا جس سے تیری طاقت کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ دنیا میں

وہی بچتا ہے جس کے پاؤں کی نسیں مضبوط ہوں۔

گر گفتہ زعشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتست کہ ازما شنیدۂ

(تقریر اجلاس جمعیت علمائے ہند، مارچ ۱۹۴۲ء لاہور)

نظام کا فقدان:

نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کردی ہے لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح ہنگامے برپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعے وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈھ نکالیں گے۔ حالاں کہ مسلمانوں کے لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ ڈھونڈھ نکالیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقے کا کھوج لگائیں:

درازی شب وبیداری من ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۴۲۹)

فطری معاہدہ:

اسلام خدا کا ایک فطری معاہدہ تھا جس کو انسان کی ظالمانہ عہد شکنی نے بالکل چاک چاک کردیا تھا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ پنجم) صفحہ ۹۲)

اسلامی زندگی سے محرومی:

صاحب شریعت نے جن کاموں کے لیے جو احکام دیے اور جو الفاظ استعمال کیے، ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور واثر گھٹانے کی کوشش کریں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں، انھوں نے مسلمانوں کو اسلام وایمان کی عملی زندگی سے محروم کردیا۔ (مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۷۹)

اسلام اور تنگ دلی:

اسلام نے تنگ دلی اور جنسی ومذہبی تعصب کی تعلیم نہیں دی ہے وہ انسانی اوصاف

وخصائل کے اعتراف اور انسانی رحم ومحبت کے جذبات کو محض تمیز مذہب وقوم کے تابع نہیں کردیتا۔اس نے ہم کو سکھلایا ہے کہ ہم ہر اچھے انسان کا احترام کریں خواہ وہ کسی مذہب کا ہو،اور خوبیوں اور وصفوں کی طرف کھنچیں خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو اور کسی قوم کے فرد میں ہوں، قرآن مجید نے ان مسیحی رہبانوں اور منصف عیسائیوں کی تعریف کی ہے جو سچائی کا ادب کرتے تھے حق کی مخالفت میں حصہ نہیں لیتے تھے اور اچھے اعمال انجام دیتے تھے،اس کے مذہبی تسامح اور بے تعصبی کے نظائر اس قدر کثیر ہیں کہ دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ اول، صفحہ ۲۶)

اجتماع وتالیف:

الذی خلق فسوی:(۸۶:۲) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع وائتلاف،اور موت وفنا نہیں ہے مگر اس کی ضد۔یہی حالت جب افعال واعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو "خیر" اور شریعہ کی زبان میں "عمل صالح" اور "حسنات" کہتے ہیں۔جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں "تندرستی" سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ "زندگی" ہے۔اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی وجماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام "حیات قومی واجتماعی" ہوتا ہے،اور اُس کا ظہور قومی اقبال وترقی اور نفوذ وتسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔الفاظ بہت سے ہیں۔معنی ایک ہے۔مظاہر گو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ وواحد کی ذات کی طرح،اُس کا قانون حیات ووجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے۔ولنعم ماقیل:

عباراتنا شتی و حسنك واحد
وكل الى ذاك الجمال يشير !

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۹)

جماعتی زندگی کے دوادوار:

وجود اور زندگی کے ہر گوشے کے لیے خدا کا قانون وجود ایک ہی ہے تم اس کے کتنے ہی مختلف نام رکھ دو مگر وہ خود ایک سے زیادہ نہیں۔اب ایک لمحے کے لیے ٹھہر واور غور کرو کہ تخلیق وتکمیل وجود کے لیے خدا کا قانون حیات کیا ہے؟

فرد کی طرح جماعت کا بھی وجود ہے۔عالم صورت کی طرح عالم معنی بھی اپنی ہستی رکھتا ہے، لیکن کوئی چیز ہو تخلیق و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے دو مختلف دوروں سے گزرے، پہلا دور "استعداد داخلی" کا ہے دوسرا "استعداد خارجی" کا۔ ضروری ہے کہ پہلے اندر کی استعداد وجود میں آئے اور ضروری ہے کہ اندر کی استعداد کی تکمیل کے ساتھ ہی باہر کی استعداد بھی اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

(رسول رحمت، ص ۲۱۱)

قومی زندگی کی جان:

اگر یہ سچ ہے کہ قومی زندگی کی جان اخلاق ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ اخلاق کی جان حریت رائے، استقلال فکر اور آزادی قول ہے۔ لیکن اخلاق ملی کی یہ روح مہالک و خطرات کی موت سے گھری ہوئی ہے۔حفت الجنة بالمکارہ۔ اس آب حیات کے حصول کے لیے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑتا ہے۔

(الہلال، کلکتہ، ۱۵ و ۲۲/ اپریل ۱۹۱۴ء ص ۳۱۲)

حیات قومی کے مقومات:

"قومی زندگی کے بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے۔ جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔یہ اس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتا اور صفحہ عالم پر اس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری و قائم یادگار ہے۔ہر طرح کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں، لیکن یہ نہیں مٹ سکتی، کیونکہ سورج کے طلوع و غروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آگسٹس، بکرماجیت، جلال الدین ملک شاہ اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کے اندر ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا حافظہ ان سے گردن نہیں موڑ سکتا۔

ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کے سامنے آتا اور ان کا دماغ غلط فیصلہ کرتا۔اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دماغی تربیت غلط ہو جاتی۔ کچھ ضروری

نہیں کہ انھوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ و تعلیل بھی کی ہو۔ نتائج تعبیر اور تعلیل سے نہیں بلکہ فعل صحیح سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے خلاف میلان پیدا نہ کر سکے۔ وہ باوجود غیر قوموں کی ہر طرح کی علمی و تمدنی چیزیں قبول کر لینے کے ان کا سنہ قبول نہ کر سکے۔ خود بخود ان کی طبیعت کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سنہ سب سے الگ اور ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعے پر ہو۔ انھوں نے اپنے دفتروں کے لیے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی، ان کے حساب و کتاب کے قواعد قبول کر لیے، ان کے حساب کی مصطلحات اور اشارات سے بھی انکار نہیں کیا، لیکن سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں ایک اینٹ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہ اپنی ہو اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام نے جو ذہنیت ان کی پیدا کر دی تھی، اسے یہ کرنا تھا۔

(رسول رحمت، ص ۴-۲۰۳)

ارضی مرکزِ سعادت:

قوم و ملت کی بقا کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے۔ اعتقادات میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھیرایا۔ جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے: ان الله لا یغفر ان یشرك به ویغفر مادون ذالك لمن یشاء (۴:۵۲)

عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھیرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرۂ اعمال منہدم ہو جاتا ہے: فمن اقامها اقام الدین ومن ترکها فقد هدم الدین۔ اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ کان اصحاب رسول الله صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال بترکه کفر غیر الصلوٰۃ (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا۔ جعل الله الکعبة البیت الحرام قیاماً للناس۔ "قیاماً للناس" پر غور کرو۔ اور چونکہ یہ مرکز ٹھیرا، اس لیے تمام دائرہ کا رخ بھی اسی طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اس طرف ہونا چاہیے۔ وحیث ماکنتم فولوا وجوهکم شطره (۲:۱۴۵)	(اذکار آزاد، ص ۲۶۹)

اسلامی اجتماعی زندگی:

اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا۔ جہاں اس کے چند خانے بگڑے سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا۔ چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے۔ لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعہ وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈ نکالیں گے، حالانکہ مسلمان کے لیے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ نکالیں ،سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقے کا کھوج لگائیں:

درازی شب و بیداری من این همه نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست

(ترجمان القرآن [جلد سوم] ص ۴۲۹)

دینی تنزل کی انتہا:

مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے، بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے، ان کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے، ان کا دینی زاویہ نگاہ غیر اسلامی ہو گیا ہے، وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں تو غیر اسلامی طریقے سے اور یہ دینی تنزل کی انتہا ہے "فما لهؤ لاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا" (۴:۷۸)

(ترجمان القرآن (جلد سوم) ص ۴۳۴)

جماعتی وصف:

سالہا سال کی کشمکش نے ایک بات بالکل واضح کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک ملکی حقوق و فوائد کے معاملات کا تعلق ہے مسلمانانِ ہند کا جماعتی وصف بے طاقتی اور بے اعتمادی ہے، اور ہندوؤں کا جماعتی وصف تنگ دلی اور کوتاہ دستی ہے۔ وہ چیز جسے دل کا کھلا ہونا اور طبیعت کی فیاضی کہتے ہیں ہمارے ہندو بھائیوں میں پیدا نہ ہو سکی۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایک ہزار برس سے ایسے حالات موجود ہیں کہ پیدا ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات کو کبھی کشادہ دلی اور وسعتِ ظرف کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ اگر دیکھ

سکتے تو کب کا یہ سارا جھگڑا ختم ہو جاتا۔ مسلمان اول دن سے بچوں کی طرح کھلونوں پر مچل رہے ہیں۔ طاقت اور تحفظ کی اصلی راہوں پر کبھی اُن کی نظر نہ گئی۔ ہندوستانی وطنیت کے مصالح کبھی اُن کے سامنے نہ آئے محض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اپنی تمام قوت خرچ کرتے رہے۔ اور اس میں ان کے لیے کوئی بڑا فائدہ نہ تھا۔ اور ہندوؤں کی گرہ سے کچھ جاتا نہ تھا اگر ہندوؤں کے اندر دانشمندی اور تھوڑی سی کشادہ دلی ہوتی، تو وہ ان کھلونوں کے ساتھ کبھی انہیں مچلنے نہ دیتے۔ وہ کہتے، اگر سارا معاملہ چند نشستوں اور اسی طرح کے چند نام نہاد فوائد ہی پر آکر رک گیا ہے۔ تو بخوشی لے لو۔ لیکن خدمت ملک میں ہمارا ساتھ دو۔

پیکان ترا بجاں خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔

(افکار آزاد، ص۵۹۔۵۸)

اسلامی تعلیم کی جامعیت:

اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا، اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے، اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد [حصہ دوم] صفحہ ۱۹)

اسلام اور عالم گیر اخوت واتحاد کی دعوت:

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خود فراموشی تھی کہ اُس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی قوموں کے باہمی اختلافات ونزاعات کا گھر

بنادیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت واتحاد کی دعوت دی۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۱۱)

اسلام کی اخوت عمومی:

تمیز قوم ومرز بوم سے پاک ہے اور اس کا ایک ہی خدا اپنے ایک ہی آسمان کے نیچے تمام پیروان توحید کو ایک جسم واحد کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے: ان ھذہ امتکم امۃ واحدہ و انا ربکم فاتقون۔

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ دوم)

اسلام کا اعلان مساوات ومحبت عالم:

اسلام کا اعلان مساوات صرف مکہ اور حجاز ہی کے لیے نہ تھا۔ بلکہ تمام عالم کے لیے تھا۔

اسلام صرف وطن ہی کی محبت لے کر نہیں آیا۔ اُس کے پاس تمام عالم کے عشق کا پیغام ہے۔ اُس نے جو کچھ کیا تمام عالم کے لیے کیا اور صرف وہی تھا جو یہ کر سکا۔ وما ارسلنٰک اِلا کافۃ للناس بشیراًونذیرا۔ دنیا کا خدا "رب العلمین" تھا جس کی ربوبیت عامہ میں کوئی خصوصیات وطن ومقام نہیں۔ اسکا پیغام امن ونجات بھی رحمۃ للعلمین ہو کر آیا۔ کہ

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین

(مقالات آزاد، صفحہ ۲۲۸)

اسلام اخوت انسانیت کا پیغام عام:

اسلام عموم رحمت وشفقت اور اخوت انسانیت کا پیغام عام ہے۔

(مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، ص..)

اسلام اور یورپ:

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اُس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا۔ مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی، اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہو گئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا۔ مسلمان علم ودانش کے علم بردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار

سے لڑنا چاہتا تھا۔ مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا۔ مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا۔ لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا۔ دوسرا روحانی اور مادی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا۔ دوسرے نے نتائج عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائج عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا!

(غبار خاطر۔ ص ۸۵۔ ۱۸۴)

اسلامی زندگی کی لذت:

"اسلام نے مسلمانوں کو جس طرح کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے، وہ محض اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے، بلکہ منزلی، خاندانی، معاشرتی، جماعتی اور انسانی فرائض کی ادائگی کی ایک پوری آزمائش ہے اور جب تک ایک انسان اس آزمائش میں پورا نہیں اترتا اسلامی زندگی کی لذت اس پر حرام ہے۔"

(ترجمان القرآن (جلد سوم) ص ۴۳۵)

قیام ہئیت اجتماعیہ۔ قومی دعا اور اس کا مقصود:

اور یہی سبب ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھلائی گئی اس میں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی "اھدنا الصراط المستقیم" فرمایا۔ "اھدنی" نہیں کہا گیا۔ یہ اسی لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان، و خلاصۂ قرآن، و عصارۂ اسلام ہے۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۱۲)

جماعتی ہستی کا امتیاز:

ہر جماعت جو دوسری جماعتوں سے اپنی جماعتی ہستی میں ممتاز ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی عملی رنگ ضرور رکھتی ہے اور اس رنگ سے اس کی زندگی کا قیام ظہور میں آتا ہے۔ جب تک یہ عملی رنگ قائم ہے، جماعت کی ہستی بھی قائم ہے، جہاں یہ رنگ گیا، جماعت کی ہستی بھی رخصت ہو گئی۔ (خطبات جمعات و عیدین، ص ۸۰)

جماعتی زندگی کی معصیت:

راہ عمل مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے، اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اس کی طرف بلایا ہے، اور جب کبھی میری زبان بلانے کے لیے کھلیگی تو صرف اُسی کے لیے کھلے گی۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اُس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں، اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اُس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں "بھیڑ" اور انبوہ "کا حکم رکھتی ہیں۔ "جماعت" کا حکم نہیں رکھتیں۔ "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں، وہاں ان کے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے۔ افراد و اشخاص کوئی شے نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہیں شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں، اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ قرآن وسنۃ نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں۔ اور جب جماعتی معصیت سب پر چھاگئی ہے تو افراد

کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، ص ۷۔۲۰۶)

اسلامی زندگی کی بنیاد:

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے: ایمان۔ عمل صالح۔ توصیۂ حق۔ توصیۂ صبر۔

"توصیۂ حق" کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ "توصیۂ صبر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر طرح کی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو جھیل لینے کی وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں، اس لیے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی، تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لیے ہر حق گو تیار ہو جائے: والعصر، ان الانسان لفی خسر، الاالذین آمنوا، وعملوا الصالحات، وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر!"

(قول فیصل، ص ۵۵)

دردانگیز حقیقت:

میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے، اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھکر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں!

(قول فیصل، ص ۶۳)

حسن وجمال ــــ اسلام:

اسلام تو اعتقاد و عمل کی ہر صداقت اور کائنات کے ہر حسن و جمال کا نام ہے جہاں کہیں صداقت اور جمال موجود ہے، یقین کرنا چاہیے کہ وہ اسلام ہے۔ گو دنیا کو اس کی خبر نہ ہو۔

(نقوش ابوالکلام آزاد ص، ۷۹)

اسلام اور زمین کی وراثت:

اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں حفاظت اسلام کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں۔ جب تک انہوں نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال و اعتقادات میں اُس اُسے منہ نہیں موڑا۔ اس وقت تک وہ بھی اُن کے ساتھ رہا لیکن جب انہوں نے اپنی صلاحیت و قابلیت کھودی اور اس مقصد کو بھول گئے جس کی انجام دہی کے لیے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی، تو ان کا دور کار فرمائی ختم ہو گیا۔ اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی امانت کسی دوسری جماعت کے سپرد کر دی وہ اپنے کلمہ مقدس کی حفاظت کے لیے ہمارا محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اپنی زندگی کے لیے اس کے دین مبین کی خدمت گذاری کے محتاج ہیں:

(مقالات آزاد، ص ۸۳۔ ۸۲)

صدائے دردانگیز!

زبان زنکتہ فروماند و راز من باقیست!
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست!

عزیزان ملت! اس طول طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اُس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی افسانہ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دہراتا رہا ہوں، اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہو گئی ہیں، تو تم اس کی تصدیق کرو گے۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوۃ بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں۔ ولکن لا تحبون الناصحین (۷۸:۵) افسوس! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے، اور وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اُتنا

ہی تمہارا انحراف آسان ہے، اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن، نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو، خطرات ہیں جنکو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں، مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑہ ہے اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں؟ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے؟ تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا، بلکہ جعلوا اصابعھم فی آذانھم، واستغشوا ثیابھم، و اصروا، و استکبروا استکبارا (۷:۷۱) کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کر دیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی، فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لیکن فلم یزد ھم دعائی الافرارا (۶:۷۱) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشۂ قید و بند میں چلا گیا، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آگیا ہوں۔ لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اُسی طرح مفقود ہے، جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اُتارو، اور ایسے پر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں، اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لیکر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔ افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں:

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالان وبدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وزدرون من نہ جست اسرار من
سر من ازنالۂ من دورنیست — لیک کس راگوش آن منظور نیست

میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی، نہ میرے سفر میں کبھی یمین ویسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں، انسانی تقلید اُس کا سر چشمہ ہے، اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع، لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی وتنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں۔ الحمدللہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا، وہ میرے عقائد و معلومات تھے، تمہارے بڑوں کی طرح آراٗ و مظنونات نہ تھے۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (۵۴:۳) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزاء کیا، کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرۃ دعوؤں کا اعلان ہے: یریدان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت وبلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسوں گری ہے: اکتتبھا فھی تملی علیه بکرۃ واصیلا (۵:۲۵) لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اُسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ، اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب اُسی "مافوق الفطرۃ دعوؤں" اور "ساحرانہ فصاحت طرازیوں" کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو، اور "قیام شریعت" اور "تقدیم واتباع شریعت" اور "حفظ ودفاع ملت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔

پس جبکہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے، تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو۔ اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو، اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو: فستذکرون مااقول لکم، وافوض امری الی الله ـ ان الله بصیر بالعباد (۴۰:۴۷)۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، ص ۱۳ـ۲۱۱)

اے علمائے امت محمدیہ!

اے علمائے امت محمدیہ! واے رؤسائے ملت اسلامیہ! اٹھو کہ وقت آگیا ہے، ہاتھ بڑھاؤ کہ صداقت طلب اعانت اور اسلام اپنے فرض کے لیے پکار رہا ہے!

سنو! صدائے حق کیا کہتی ہے؟ کیا علما و رؤسائے بنی اسرائیل کی طرح تمہارا بھی ارادہ اس عہد شور و شر میں خاموشی و سکوت کا ہے تاکہ تمام قوم کو ہلاکت و بربادی کا سامان ہو؟ کیا تم سب سے پہلے اس بات کے لیے جواب دہ نہیں ہو جس کے لیے تمام امت جواب دہ ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بنی اسرائیل کا پہلا گناہ اس کے عالموں اور پیشواؤں ہی سے نکلا تھا؟ آہ سنو کہ مخبر صادقﷺ کی آواز بے کیف کیا کہہ رہی ہے:

والذی نفس محمد بیده لتأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و ليوشكن الله ان يبعث عليكم عتاباً من عنده ثم لتد عونه فلا يستجاب لكم (رواه احمد والترمذی)

اس ذات اقدس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدﷺ کی جان ہے، تم فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا نہ کرو، ورنہ خدا تم پر اپنا عام عذاب بھیجے گا پھر تم پکارو گے، لیکن قبول نہ کیا جائے گا۔

(الہلال کلکتہ، ۱۲/ مئی ۱۹۱۴ء ص، ۳۵)

توحید:

اصل دین توحید ہے۔ یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنی۔ اور تمام بانیان مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لیے گئے ہیں۔ اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

(ترجمان القرآن، صفحہ ۳۸۲)

عقیدہ توحید:

تمام شرائع کا اس اساس اور اصلاح عالم کی اصل بنیاد عقیدہ توحید خالص اور منع شرک و ماسوی اللہ پرستی ہے۔ آغاز ظہور ہدایت سے اسی کی تبلیغ ہوتی رہی اور تمام انبیاء و رسل اسی کے قیام و اعلان کے لیے آئے، لیکن اب تک جو کچھ ہوا تھا، وہ صرف اسی قدر تھا کہ شرک صریح سے روکا گیا تھا۔ وسائل و ذرائع شرک کے سد باب کا کچھ انتظام نہیں ہوا تھا اور

اسی وجہ سے تمام پیروان رسل توحید سے آشنا ہو کر پھر دوبارہ شرک واصنام پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے"

(افاداتِ آزاد، ص ۷۸)

عقیدہ توحید۔ سرچشمہ ٔحیات:

اسلام کے بھی اصول ہیں اور فروع ہیں۔ پس مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اصول میں ڈھونڈھنا چاہیے، نہ کہ فروع میں۔ اسلام کی اولین اصل "عقیدہ ٔتوحید" ہے۔ اس عقیدہ کے اندر مسلمانوں کی تمام روح حیات مضمر تھی۔ اور اسی روح نے ان کو دائمی زندگی کی خوشخبری سنائی تھی لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اسی عقیدہ سے انحراف کیا۔ حتی کہ آج اس سے بڑھ کر اور کسی اعتقاد میں وہ تجدید دعوت کے محتاج نہیں ہیں۔ جس طرح عقیدہ ٔتوحید کے معنی یہ نہ تھے کہ مشرکین مکہ کی طرح زبان سے تو ایک صانع کل کا اقرار کر دیا جائے (لیقولن اللہ) لیکن اپنی عملی زندگی پر صدہا غیر الٰہی عبودتیوں کی لعنت بھی طاری کر لی جائے اسی طرح توحید کی حقیقت کے ساتھ یہ ضلالت بھی جمع نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک فاطر السموات و الارض کی بندگی کا دعویٰ کر کے بہت سے خداؤں کے ماننے والوں کی طرح بہت سی جماعتوں اور شکلوں میں متفرق ہو جائیں۔ اعتقاد توحید کا اولین مطالبہ یہ تھا کہ تمام کرہ ارضی کی سعادت و ہدایت کے لیے ایک ایسی امت عادلہ تیار ہو جو تمام پچھلی قوموں کے برخلاف اپنے تمام عقائد و اعمال کے اندر جلوہ ٔتوحید رکھے، اسکا خدا ایک ہو اس کا مبدء ٔحکم و سلطانی ایک ہو۔ اس کا مصدر امر و نہی ایک ہو۔ اس کا قبلہ ایک ہو اس کا نام ایک ہو اس کے خصائص و اعمال ایک ہوں۔ یعنی جس طرح اسکا خدا وحدہ لاشریک ہو اسی طرح اس کا قرآن بھی اپنی ہدایت میں، اس کا رسول بھی اپنی تعلیم کتاب و حکمت میں اور اس کی امت بھی اپنے خصائص و محامد اور وحدت و یگانگت میں وحدہ لاشریک ہو۔ ان ھٰذہٖ اُمتکم امۃً واحدۃً و انا ربکم فاتقون۔

(افکار آزاد، ص ۷۴-۱۴۶)

مومن کی اقلیم دل اور اس کی بادشاہت:

آدم کی اولاد دو کی محکوم نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک سے ملے گی۔ دوسرے کو چھوڑے

گی۔ایک سے جڑے گی، دوسرے سے کٹے گی۔ پھر خدارا مجھے بتلاؤ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا اور کس سے ملے گا؟ ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے۔ ایک باقی رہے گا۔ ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر مجھے بتلاؤ کہ مومن کی اقلیم دل کس کی بادشاہت قبول کرے گی؟

(دعوتِ عمل، ص ۶۔۵)

ایک آقا کی نوکری:

یاد رہے کہ ہر اطاعت کے لیے ایک سرکشی، ہر وفاداری کے لیے ایک دشمنی اور ہر عاجزی کے لیے ایک غرور و تمرد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر ہو نہیں سکتے جب تک کہ اور تمام آقاؤں سے انکار نہ کر دیں۔

(صدائے حق، ص ۳۳)

توحید فی الصفات:

لوگ بھول گئے ہیں کہ اسلام کا مایۂ شرف محض اعتقادِ توحید نہیں بلکہ تکمیل توحید ہے اور تکمیل توحید کی اصل واساس "توحید فی الصفات" ہے۔

(مساجدِ اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ، ص ۲۸)

شرک اور غیرت الٰہی:

یہودیوں نے خدا کو ایک قاہر و جابر شہنشاہ کی صورت میں دیکھا، اور اسرائیل کے گھرانے سے اُس کا رشتہ ایسا ہوا جیسا ایک غیور شوہر کا اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا مگر اُس کی بے وفائی کبھی معاف نہیں کرے گا کیونکہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اُس کی محبت کے ساتھ کسی دوسرے کی محبت بھی شریک ہو۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء چنانچہ تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم یہ تھا۔ تو کسی چیز کی مورتی نہ بنائیو، نہ اُس کے آگے جھکیو، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا ایک غیور خدا ہوں لیکن پھر زمانہ جوں جوں بڑھتا گیا، یہ تصور بھی زیادہ وسعت اور رقت پیدا کرتا گیا یہاں تک کہ یسعیا (Isaiah) ثانی کے زمانے میں اُس تصور کی بنیادیں پڑنے لگیں جو آگے چل کر مسیحی تصور کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ چنانچہ مسیحیت نے شوہر کی جگہ باپ کو دیکھا۔ کیوں کہ باپ اپنے بچوں کیلیے سر تا سر رحم و شفقت اور یک قلم عفو

درگذر ہوتا ہے:

من بدکنم وتوبد مکافات دہی
پس فرق میان من و توچیست بگو!

(غبار خاطر، ص۵۷۔۱۵۶)

صرف دوراہیں:

تیسری راہ اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں۔ راہیں صرف دوہی ہیں۔ فمن شآءَ فَلیؤمن ومن شآءَ فلیکفر۔ حضرت مسیح نے کہا ہے "ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کرسکتا۔" قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے۔مَاجعل اللہ لِرجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ(۳۳۔۴) یعنی سینے میں کسی شخص کے دودل نہیں ہوتے۔

(افکار آزاد، صفحہ ۹۲)

نجاست اعتقاد و عمل:

وہ (اسلام) کسی انسان کو بہ حیثیت ایک انسان کے نجس قرار نہیں دیتا، جس کی چھوت سے مٹی اور اینٹ ناپاک ہو جائے۔ نجاست انسان کے جسم میں نہیں بلکہ اس کے اعتقاد اور عمل میں ہوتی ہے۔ کاش! جسم میں ہوتی تو دریا کا پانی اسے دھو دیتا اور انسان کا بنا ہوا کپڑا اسے پونچھ دیتا۔ مگر افسوس! وہ دل اور عمل کی گندگی ہے جس پر نہ تو پانی بہایا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ہاتھ صاف کرسکتا ہے۔اسے صرف خدا کا سچا ایمان اور راستی کا کامل عشق ہی پاک کرسکتا ہے۔

(جامع الشواہد... صفحہ ۷۵)

شک کا عارضہ اور ہدایت کا ظہور:

اصل یہ ہے کہ انسان کے عارضۂ شک وشبہات اور موت انکار جود کا اصلی سرچشمہ خود اس کی ضلالت فکر و نظر کی ایک طبیعت ثانیہ ہے جو انسان کی ہدایت اصلی واولی کے بعد ہی اسباب مذکورۂ قرآن وسنت کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اور جس طرح ظہور ہدایت ودعوت الی الیقین میں حقیقت کا ظہور یکساں رہا ہے، ٹھیک اُسی طرح اس طبیعتِ ثانیہ وعارضہ کا ظہور بھی ایک ہی صورت ایک ہی رنگ روپ، ایک ہی لب ولہجہ بلکہ ایک ہی طرح کی آوازوں اور بولیوں میں ہمیشہ ہوتا رہا۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۵۔۲۲۴)

شک کا مرض اور اس کا علاج:

یہ نقطہ بھی پیش نظر رہے کہ انسانی معلومات کے عدم سے حقیقت معدوم نہیں ہو جاسکتی۔ اگر کسی دوا کا خاصہ ابو بکر رازی و ابن بیطار سے پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھا، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں اس سے پہلے وہ دوا موجود بھی نہ تھی۔ کونین ہمیشہ سے موجود، اور جب سے موجود، اسی وقت سے دافعِ تپ؛ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا خاصہ تمہیں کل معلوم ہوا۔

بہر حال یہ مثال بعینہ امراض معنویہ از قبیل شکوک و شبہات و انکار جحود اور ان کے علاج کی بھی ہے۔ شک و شبہ و انکار کا مرض ایک ہی ہے اور اس کا علاج بھی ایک ہی ہے ہمیشہ سے یکساں مرض، اور ہمیشہ سے یکساں علاج، یہ بات نہیں ہے کہ معلومات و مکشوفات کے بدلنے سے وہ بھی بدل جائے۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۳۶_۳۷)

شک اور غفلت کا روگ اور کامیابی کی توقع:

کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے۔ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو۔ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول بھی پا سکتے ہو؟ جب تک تمھارے اندر طلب کے لیے حق نہ ہو۔ کیا ایک لمحہ کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمھیں دکھا سکتی ہے، جب تک تم حق کی راہ میں قربانیاں چڑھانے کے لیے تیار نہ ہو۔ خدا کی اس کائنات کے ایک ایک ذرے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے۔ اور اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لیے ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمھارے لیے بدل دے گا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

(خطبات آزاد، صفحہ ٦١)

کفر محض اور کفر جارحانہ:

قرآن نے "کفر" کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ انکار محض ہو، ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔

انکار محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس لیے کہ اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لیے کہ جو راہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے، بہر حال کوئی وجہ ہو، لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے، بلکہ اس کے اندر تمہارے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائے گا، تم کتنی ہی اچھی بات کہو، وہ تمہیں جھٹلائے گا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو، وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم کہو: روشنی تاریکی سے بہتر ہے، تو وہ کہے: تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ تم کہو: کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے، تو وہ کہے: نہیں، کڑواہٹ ہی میں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے۔

(ترجمان القرآن، ا، صفحہ ۷۔۲۰۶)

تقلید اور وہم پرستی:

جب ایک جماعت تقلید و وہم پرستی میں اس درجہ ڈوب جائے کہ عقل و بصیرت کی کوئی بات بھی اس کے اندر نہ اتر سکے تو پھر اقناع فکر کی صرف یہی ایک راہ رہ جاتی ہے کہ ان کی عقل کی جگہ ان کے حواس کو مخاطب کیا جائے اور کوئی ایسی بات کر کے دکھا دی جائے جس سے ان کی ساری وہم پرستیوں کا بطلان ہو جائے۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۴۷۷)

تقلید و اطاعت:

تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا حد اعتدال سے گزر جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن و دماغ سے کام لے محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بن جاتا ہے مذہب اور علم دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی و سعادت کے لیے سب سے بڑی روک ثابت ہوئی ہے اور ہمیں کبھی نہیں چاہیے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں۔ برخلاف اس کے

اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی وکامیابی کے لیے روک ہے۔ اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے۔ ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو لیکن سپاہی اسکے خلاف رائے رکھ سکتا ہے۔ مگر خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے، کٹ جائیں لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت جائے۔

(خطبات ابوالکلام آزاد، ص ۲۹۰-۹۱)

دماغی ترقی اور تقلیدی عقائد:

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک، اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑبند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطہ نگاہ، جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم وصحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے، اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کریگا مگر اسے چھونے کی جراءت نہیں کرے گا۔ بسااوقات موروثی عقاید کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی، لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔ (غبار خاطر، صفحہ ۱۳۳)

تقلید پرستی اور تفکر و تدبر کی قوت:

انسان کے ارتقائے ذہنی وفکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آرہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں۔ لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے۔ جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد۔ ۲، بدرالحسن ، صفحہ ۴۱)

اطاعت واقتدا:

بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ "اطاعت" اور اقتدا" کا فرق نہ سمجھے۔ جن حدیثوں میں "اقتدا" کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا، ان کو منع اطاعت اور جواز خروج پر محمول کرلیا۔ خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا۔ ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام مطلق سمجھ لیا، اور منع اقتداوتاسی اور وجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کردی تھی، وہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یعنی اس دھوکے میں پڑگئے کہ جب امراؤ حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، خواہ ان کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں، تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر ٹوکیں، نہ منکرات کے خلاف جدوجہد کریں۔ ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں۔ یہ جو صدیوں سے علماو مشائخ نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یک قلم ترک کردیا ہے، تو نفس خادع ان کو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے اُن لوگوں نے چونکہ "اطاعت" اور "اقتدا" کا فرق نہیں سمجھا، اور دیکھا کہ پادشاہوں اور امیروں کو بُرائی پر ٹوکنے اور ان کے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، اس لیے اس دھوکے میں پڑگئے کہ یہی مصائب فتنہ ہیں۔ بس اس فتنہ سے بچنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ تمام زبانیں گونگی اور تمام دل مردہ ہوکر رہ گئے۔

حالانکہ دونوں جماعتوں نے ٹھوکر کھائی۔ دونوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا۔ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں اور ایک پادشاہ کی جیسی فرماں برداری رعایا کو کرنی چاہیے ٹھیک ویسی ہی فرماں برداری بجالائیں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے۔ اس کا نام اطاعت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں پیشوا مان لینا اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنالینا اور اس کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرنا اس کا نام اقتداتاسی ہے۔ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ "اطاعت" ایک عام حالت ہے اور اس میں "اقتدا" کی حالت بھی داخل ہے، لیکن "اقتدا" اطاعت سے زیادہ خاص ہے اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت "اقتداء" بھی ہو۔ احادیث میں خلفاء راشدین کی

نسبت امت کو "اطاعت" اور "اقتدا" دونوں کا حکم دیا گیا لیکن بعد کے خلفاء وسلاطین کو صرف "اطاعت" کا مستحق بنایا۔ "اقتدا" کا نہیں۔ کیونکہ معلوم تھا کہ اُن کے کام اچھے نہ ہوں گے۔ شریعت وعدالت سے منحرف ہو جائیں گے۔ اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب وسنت اور عدل وصداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا، اس لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا۔ یعنی حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مان کر پوری پوری اطاعت کرو۔ لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ اور دن کو رات مان لو حق حق ہے۔ باطل باطل، برائی جب دیکھو، ٹوکو۔ ظلم جب کیا جائے روکو، اس کام میں ایک بادشاہ اور ایک مزدور دونوں برابر ہیں "لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" قاعدہ کلیہ ہے، اور وتواصوا بالحق وتواصوابالصبر حکم عام ومطلق کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم سے نافرمانی کرنی پڑے۔ اور یہ جو جابجا کہا گیا کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ تو یاد رہے کہ "اطاعت" نہ کرنے میں فتنہ ہے نہ کہ "اقتدا" نہ کرنے میں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں یعنی خلیفۂ اسلام سے بغاوت نہ کرو۔ اس میں جمعیت امت کے لیے بڑا ہی فتنہ ہے یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے۔ حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کے لیے نظم وامن ہے۔ وہ کبھی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظامِ ہستی کس بنیاد پر قائم رہے؟"

(افکارِ آزاد، ص ۷۷۔ ۷۴)

وہم وخیال:

لوگ اپنے سائے سے بھڑکتے ہیں اور ایمان کے لیے اگرچہ یقین واثبات کے طالب ہیں مگر ڈرنے کے لیے وہم وخیال کو کافی سمجھتے ہیں۔

(تبرکات آزاد، ص ۳۹۔ ۱۳۸)

وہم فاسد:

افسوس! خود مسلمانوں کو اسلام کی قوت وصداقت پر بھروسہ نہ رہا۔ نادان سمجھتے ہیں کہ دوسروں سے اگر ہم ملیں گے تو ہم ان میں جذب ہو جائیں گے! انھیں اپنے میں جذب نہیں کر سکیں گے اور سچ یہ ہے کہ اس وہم فاسد سے بڑھ کر اور کوئی خیال اسلام کے لیے

مایۂ صد توہین و تذلیل نہیں ہو سکتا۔

(جامع الشواہد..، ص ۱۷)

اصلی مبداء ضلالت:

ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لیے پہلی منزل "تقلید" کی بندشوں کو توڑنا ہے، کیونکہ تقلید کے اہر من سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں۔ ان سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے۔ اس لیے راہ اصلاح کا اولین منظر یہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسانوں کو نجات حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا، اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد۔ ۲، بدرالحسن، ص ۴۸)

تقلید آباو رسوم کی ہلاکت:

تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے، جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لیکر آیا فی الحقیقت اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے۔ بت پرستی اور انسان پرستی کی یہ تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباو رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن نے اپنی نئی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد۔ ۲، ابوالحسن، ص ۴۱)

راستے کی رکاوٹ:

خواہ مذہبی اصلاح ہو یا اخلاقی، تمدنی ہو یا سیاسی، ہر راہ میں پہلا پتھر تقلید کا حائل ہوتا ہے، اور اگر یہ ہٹ جائے تو پھر آگے کے لیے راہ صاف ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد۔ بدرالحسن صفحہ ۴۱)

زندگی اور حرکت:

خطرات کا معاملہ زندگی اور حرکت میں ہوتا ہے۔ جمود اور سکون میں نہیں ہوتا۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

فطرت کی سادگی اور سچائی کی دل نشینی:

دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے۔ اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے، بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی۔ ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دل نشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح اجنبیت محسوس نہ ہو، وہ اس طرح قبول کرلے گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات تھی۔ اردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(ترجمان القرآن جلد اول، صفحہ ۸۔۷)

خدا کی سچائی:

خدا کی سچائی، اس کی ساری باتوں کی طرح، اس کی عالمگیر بخشش ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص زمانے سے وابستہ کی جاسکتی ہے، نہ کسی خاص نسل و قوم سے، اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لیے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حدبندیاں بنالی ہیں، لیکن تم خدا کی سچائی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے، اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے، نہ جغرافیائی حدبندی ہے، نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈھ میں ہو تو اسے کسی ایک ہی گوشے میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمھیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خدا کا اور اس کی عالمگیر سچائی کا پرستار ہونا چاہیے اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو، تمھاری متاع ہے اور تم اس کے وارث ہو۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۴۱۱)

سچائی اور اس کا ثمرہ:

سچے کام کے کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے۔ مگر جب کبھی کیا جائے، سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت نا موافق ہے، نہ کوئی جگہ مخالف اُس کے کرنے میں جس قدر دیر ہو جائے گی معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب کبھی کر دیا جائے، سچائی اور نیکی ہے اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، ص ۲۰۸)

نیکی اور صداقت کی پیروی یا افراد یا اسماء کی پرستش:

انسان کی ایک عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اُس کی روح کے لیے اختیار کرتا ہے لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر و سلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمال حسنہ کی یاد، اور نیکی و صداقت کے عملی نمونوں کو پیروی و اتباع کے لیے قائم رکھنا تھا۔ لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی، اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لیے واسطہ و ذریعہ تھی، خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد و اعمال میں جاگزین ہو گئی، اور حقیقت سے اس قدر بعد و نسیان ہو گیا کہ محض رسوم و اسماء کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قانع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی بسا اوقات دنیا میں بت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے، اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد و اسماء کی پرستش محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہنچا دیا۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۲۲۱)

صداقت کا عدم ضیاع:

دنیا میں ہر چیز مٹ سکتی ہے، پر حق اور صداقت ہی ایک بیج ہے جو پامال نہیں ہو سکتا۔ واللہ سبحانہ یقول "انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر وانثیٰ"

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۵۱)

نیکی:

نیک عمل کو اچھا کہو! کیوں کہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

اولادِ آدم اور نیکی و بدی کی قوتیں:

آدم کی اولاد بلا استثنا اپنے اندر نیکی اور بدی کی وہ تمام قوتیں رکھتی ہے جو خدا نے اس کو ودیعت کی ہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۵۲)

جاننا اور عمل کرنا:

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اُس کے لیے نئی نہیں ہے لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے ہر آدمی کو معلوم ہے لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے واشنگٹن جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھی۔

(خطبات ابوالکلام آزاد، ص ۲۷۲)

حق و صداقت کی مقاومت:

حق و صداقت کی مقاومت ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ دست ستم اس میں خلل ڈال سکتا ہے، ضرر پہنچا سکتا ہے پر اس کو فنا نہیں کر سکتا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، [حصہ سوم] صفحہ ۳۵)

سچ کا کمال:

سچ ہے۔ "کمال" اور "حسن" ہی میں یہ اعجاز ہے کہ اگر تم پہاڑ کا جماؤ اور سمندروں کا طوفان بھی اپنے اندر پیدا کر لو، جب بھی اُس کے سامنے ایک اُڑتے ہوئے تنکے کی طرح گر جانے سے اپنے تئیں نہیں روک سکتے۔ اگر تم اپنے سر کو جھکنے سے اور زبان کو بولنے سے روکو گے، تو سچائی کا فرشتہ اپنے آہنی پنجوں سے تم کو گرا دے گا، اور حقیقت کا ہاتف تمہارے حلق کے اندر بیٹھ کر تمہاری زبان کو ایک مدہوش بے اختیار آدمی کی طرح کھول دے گا۔ سچائی جب اپنی گواہی پتھروں کو چلا کر لے سکتی اور درختوں کو بلوا کر دلا سکتی ہے، تو انسان کی روح و زبان کب اُس کے فرمانِ قضا سے باہر رہ سکتے ہیں! دنیا میں کامل طاقت اور بیباک حکم صرف سچائی کا ہے۔ یا اس کے دوسرے عرف میں کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا۔ اس کے سوا کون ہے؟

اے سنگ بر تو دعوےِ طاقت مسلّم است
خود را نہ دیدۂ بہ کفِ شیشہ گر ہنوز!

(تذکرہ، صفحہ ۵۴-۲۴۹)

سچائی کا ثبوت:

انسانوں کی کسی بڑی تعداد کا کسی بڑی مدت تک ایک بات مان لینا اور کیے جانا سچائی کا ثبوت نہیں۔ سچائی کا ثبوت صرف عقل سلیم کی حجت ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۷۷۳)

سچ کی کسوٹی:

سچ کی کسوٹی اسکے حامیوں کی کثرت نہیں ہے۔ اسکے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

حق وصداقت کی فتحیابی:

حق وصداقت اور اللہ کا پیغام دعوت ہر حال میں فتحیاب و منصور ہوتا ہے، اور باطل وضلالت کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا خواہ کتنا ہی ساز و سامان ہو اور عارضی و وقتی کامیابیاں خواہ کتنا ہی اُسے مغرور کردیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد ہی ہوتی ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۳۸)

صداقت کی مظلومی:

رات اور زلف کا یہ افسانہ قصہ کوتہ، بڑی کہانی ہے

صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، اس پر آزمائش وابتلاء کے ایسے ایسے ہلاکت خیز وقت آئے ہیں جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل صداقت اپنی حامیوں کی کثرت و قلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پرواہی ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ تمہارے پاس اس لیے نہیں آتی کہ تمہاری محتاج ہے، بلکہ اس لیے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ اگر تم نے اپنے تیئں اہل ثابت نہیں کیا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے گی اور کسی اور مستقل دل کو اپنا نشیمن بنائے گی"۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، ۲، بدرالحسن، صفحہ ۳۰۱)

جھوٹ اور حرفِ حقیقت:

جھوٹ کا کارخانہ کتنا ہی مضبوط بنایا جائے، آخر اسے ٹوٹنا اور نابود ہونا ہے۔ دوام وثبات حرف حقیقت ہی کے لیے ہیں۔

(تبرکاتِ آزاد، ص ۲۶۴)

جھوٹ اور سچ:

جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو، سچ نہیں ہو جاسکتا۔ سچ کتنے ہی ناموافق حالات میں اپنے کو پائے، لیکن جھوٹ نہیں ہو جاسکتا۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۸۳۱)

خدا کی سچائی:

خدا کی سچائی ایک ہے۔ اگرچہ طرح طرح کے ماحول میں پیش کی جائے۔

(ذکر آزاد، ص ۱۴۷)

سچائی اور خلوص:

دنیا میں صرف سچائی اور خلوص میں زندگی ہے خلوص کبھی ضائع نہیں جاتا اور سچائی کبھی نہیں مرتی۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

ایمان و ضمیر کا حکم:

مخالفت اس لیے نہیں کی جاتی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں اور لوگ چیرز کا ہنگامہ بپا کر کے خیر مقدم کریں بلکہ صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیر کا حکم ہوتا ہے کہ ایسا کرو۔ یہ حکم بالکل اس سے بے پرواہ ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ کوئی سچی بات اس لیے نہیں ترک کر دی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ، سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، ۲، بدرالحسن، صفحہ ۲۹۹)

سچائی کا ظہور اور شرارت کی جتھا بندی:

دنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے، کچھ نے انکار کیا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے ان کے خلاف

طغیان وجود و ظلم و شرارت کی جتھابندی کرلی ہے۔ قرآن کا جب ظہور ہوا تو اس نے بھی یہ تینوں جماعتیں اپنے سامنے پائیں۔ اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا۔ دوسری کو دعوت و تذکیر کا مخاطب بنایا، مگر تیسری کے ظلم و طغیان پر حسبِ حالت و ضرورت زجر و توبیخ کی۔ اگر ایسے گروہ کے لیے بھی اس کے لب و لہجہ کی سختی، "رحمت" کے خلاف ہے تو بلاشبہ اس معنی میں قرآن رحمت کا معترف نہیں اور یقیناً اس ترازو سے اس کی رحمت تولی نہیں جاسکتی۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۲۰۸)

قربانی اور نتیجے کا لزوم:

یہ حق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، ص ۹۴)

طاقت کا گھمنڈ اور سچائی کی طاقت:

یہ کرۂ ارض کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے آج اُس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی۔ اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا، اور مورخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جاسکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔

(افکار آزاد، صفحہ ۸۸)

اظہار حق:

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمراں کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اُسکا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمراں ظالم ہے! یہ واقعہ خلیفۂ عبدالملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴۔ الف کو اس

سزا کے ساتھ تول لے سکتے ہو!

(قول فیصل، ص ۶۳)

دعوتِ اسلام کی اساس اولین:

اسلام نے اپنی تعلیم اور دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقا کے لیے اساس اولین اور نظام بنیادی ایک اصول کو قرار دیا ہے اور اس کو وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

(صدائے حق، ص ۷)

اسلام کا اہم فرض:

اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے بعد جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے۔ وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اسی لیے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو روکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اپنی ساری بڑائی کھودیں: کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر۔

قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کی کوئی لالچ ان پر غالب آسکتی ہے، نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے ہیں تو صرف خدا سے، اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"

(قول فیصل، ص ۵۴)

ہر مسلمان کا فرض:

فی الحقیقت حق کا اعلان اور گمراہی کا روکنا ایک ایسا فرض اسلامی تھا جس کو مثل نماز اور زکوٰۃ کے ہر مومن و مسلم پر فرض کر دیا گیا تھا اور دنیا میں اس امت کو خدا کی طرف سے یہ خدمت تفویض کی گئی تھی کہ حق کے قیام اور گمراہی کے انسداد کا اپنے وجود کو ذمہ دار سمجھے اور ہر چیز کو گوارا کرلے مگر حق کی مظلومی کی اس کو برداشت نہ ہو۔

(صدائے حق، ص ۳۶)

پیدائشی حقوق کی پامالی۔ انسانیت کے قتل عام سے کچھ ہی کم:

میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یکسو تھی۔ میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں: ایک یہ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے۔ اس لیے فتح وشکست کا پہلا فیصلہ یہیں ہوگا۔ دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ لیکن موجودہ حالات نے بتلادیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادی تقریر اور آزادی اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر مل کی زبان میں "انسانیت کے قتل عام سے کچھ ہی کم" کہی جاسکتی ہے، لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجھک کے علانیہ ہورہی ہے۔ پس میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کردیا، اور فیصلہ کرلیا کہ اُسوقت تک کلکتہ ہی میں رہوں گا جب تک دوباتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آجائے: یا گورنمنٹ اپنا کمیونک اور آرڈر واپس لے لے یا مجھے گرفتار کرلے۔

گورنمنٹ نے ۱۰ر دسمبر کو مجھے گرفتار کرلیا۔ میں پورے اطمینان اور مسرت کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہوا کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک فتح مند میدان چھوڑرہا تھا۔

(قول فیصل، ص ۴۱۔۴۰)

کتمان حقیقت:

میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہر حال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔الف کا مقدمہ چلایا جائے گا!

(قول فیصل، صفحہ ۶۳)

ظالم گورنمنٹ:

"ایسی گورنمنٹ ظالم ہے۔ جو گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو، ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیے یا دنیا سے مٹادینا چاہیے"۔ (قول فیصل، ص ۴۶)

گورنمنٹ اور قتل کا جواز:

لوگوں کو بتلایا ہے کہ جو گورنمنٹ جلیانوالا باغ امرتسر میں چند منٹوں کے اندر

سیکڑوں انسانوں کو قتل کرڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے، اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔ (قول فیصل، صفحہ ۴۷)

مسلمانوں کا اسلامی فرض ـــــ حق گوئی:

دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں، پیشواؤں بزرگوں، مصنفوں کے تراجم (Biography) تمام تر اسی قربانی کی سرگذشت ہیں!

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراونی چیز نہیں ہوسکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے!

(قول فیصل، ص۵٦)

غلامی:

محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ بس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی، اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

(قول فیصل، ص۴۹)

کتمانِ شہادت:

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں ''شاہد'' ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے یہی انکا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے، اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیرکٹر) ہے جو ان کو تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے: وکذالك جعلنا کم اُمة و سطاً لتکونوا شهداء علی الناس! اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا۔ ''انتم شهداء الله فی الارض'' (بخاری) تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو۔ پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے، اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

اگر وہ باز رہے، تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمان شہادت" ہے۔ یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے۔ اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمان شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہو گئیں۔

(قول فیصل، ص ۵۴)

سیاہ کو سفید کہنے سے انکار:

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو، میرے علم میں کوئی نہیں۔ (قول فیصل، ص ۴۸)

بدترین گناہ:

میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

(قول فیصل، ص ۴۷)

اعلان حق کا وجوب:

میرے عقیدے میں ضرورت اور وقت، جب حق کے ساتھ جمع ہو جائیں تو پھر خدا کے اس بنائے ہوئے سقفِ نیلگوں کے نیچے کوئی شے ایسی نہیں جو اعلان کے لیے "مجبوری" ہو سکے، اور اگر ہو تو وہ تمہارے حس کا قصور ہے۔ "اعلان حق" کے وجوب کا بطلان نہیں ہو سکتا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۸۳)

اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت:

تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا ہے، جنہوں نے علانیہ حکام وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو، اور ان تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی جھیل نہ لیا ہو جو اس راہ میں پیش آئی ہیں۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ:

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے، تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے، جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اُسے علم ویقین دیا گیا ہے، ہمیشہ اُس کا اعلان کرتا رہے، اور اداء فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم وجور کا دور دورہ ہو جائے، اور جبر وتشدد سے اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارہ کر لیا جائے، اور "دو اور دو" کو اس لیے "چار" نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جائے، اور حق کے اُبھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ قدرت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدل جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے۔ اور اسوقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے، اور اُسوقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔۔۔ اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا، آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو جا سکتی!"

(قول فیصل ، صفحہ ۵۳۔۵۲)

سعی وعمل کا تخت عظمت واجلال اور عیش وکامرانی کی محکومیت:

اس نے دنیا کے آرام وراحت اور عیش وکامرانی کو انسان کے ماتحت نہیں بلکہ انسانی اعمال کا محکوم بنایا ہے۔ اور جب تک کوئی قوم خود اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کر دیتی اُس پر زمین کی راحتوں کا دروازہ بھی بند نہیں ہوتا۔

......یہ انقلابات قدرتی ہیں اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور ملکوں پر اس کے گذر چکے ہیں؟ آج امید و کامیابی کے جس آفتاب سے غیروں کے ایوان اقبال روشن ہو رہے ہیں کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے۔ اور جس بہار کے موسم عیش و نشاط سے ہمارے حریف گذر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باغ و چمن ہی میں اس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کہیے کہ کہنے کا وقت ہی چلا گیا!

(مقالات آزاد، صفحہ ۶۶۔۶۵)

استقامت عمل:

ہر وقت اسے پیش نظر رکھیے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

ہاں! رہِ عشق است کج رفتن نہ دارد بازگشت

جرم را ایں جا عقوبت ہست واستغفار نیست

دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے، لیکن جب اتر گئے تو پھر موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خوں خوار نہنگوں سے سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں کے وجود سے بیخبر نہیں ہونا چاہیے۔
(نقش آزاد، ص ۴۔۳)

حقیقت جہاد:

جہاد کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان، بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا۔ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء و قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اُسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈاروِن اور رسل والیس متنازع للبقا (Struggle for Existance) اور انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا

ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح وامثل کے لیے ہے تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو، اور فطرت کے قتل وغارت کا افسانۂ خونین تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن واسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے، اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے؟ پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق وہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد واعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں: لیظہرہٗ علی الدین کلہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل وغارتگری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں، اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حق دار ہیں اس کو تو تم گوارا کرلو لیکن اگر اسلام کہے کہ "ان الارض للہ ولرسولہ" خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر وضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے تو تم اس کو وحشت اور خوفناکی کہو؟

(افکارِ آزاد، ص ۷۴۔۷۳)

دنیا اور حریفانہ کشمکش:

دنیا ایک میدانِ کارزار ہے اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو دراصل یہ ایک حریفانہ کشمکش اور مقابلہ ہے پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح وشکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اسے کامیابی وناکامی اور فیروز مندی ونامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ ہماری ہی تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر وسینہ میں بھی زخم کے نشان پائیں؟ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، لیکن سپاہی کو زخموں پر زخم کھا کر بھی اُف نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں بلکہ میدان جنگ ہے۔

(افکار آزاد، ص، ۲۸۔۱۲۷)

سعی وتدبر:

انسان کا فرض سعی وتدبیر ہے، اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے، اس کو سعی

و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے۔ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے، اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے۔ڈاکٹر بھی جواب دیدیتے ہیں، تاہم سعی وعلاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے، تو تعجب ہے کہ قوم و ملت کے ساتھ نہ ہو؟ کس کو معلوم ہے کہ کب دروازہ رحمت کھلنے والا ہے؟ اور کب بارش ہونے والی ہے؟ دہقان کا کام صرف یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے:

چون دمبدم عنایت توفیق ممکن است

در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ اول، صفحہ ۵۳)

استقامت فی السعی اور کشود کار:

اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو نوافل تہجد کی مداومت کرو۔ فرائض کے سوا تمام نمازیں حتی الوسعی تنہائی میں پڑھی جائیں اور استحضار قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ ''کمیت'' سے زیادہ ''کیفیت'' کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اس بات سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ فوراً کشود کار نہیں ہوتا۔اگر استقامت کے ساتھ سعی جاری رہی تو بہ حکم والذین جاھدو افینا لنھدینھم سبلنا ۔ کشود کار یقینی ہے۔طلب وسعی کی زندگی بہ ذات خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے۔اس سے اپنے آپ کو محروم نہ رکھیں۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۸۰۔۱۷۹)

خواص اعمال وعقاید:

دیگر اشیاء کی طرح عقائد واعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں جو کبھی ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔باطل کے لیے ہمیشہ مٹنا ہے اور حق کے لیے ہمیشہ قائم رہنا ہے۔فساد کا خاصہ ہمیشہ ہلاکت ہے اور اصلاح کا نتیجہ ہمیشہ زندگی۔ ظلم وجور ضرور ہے کہ جب کبھی ہو بالآخر شکست کھائے اور عدل وصداقت کے لیے ضروری ہے کہ جب کبھی ہو فتح پائے۔قرآن حکیم نے اسی قانون معنوی کو جا بجا سنۃ اللہ و فطرۃ اللہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔کیونکہ فی الحقیقت یہی ناموس خلقت ہے۔ آئین طبیعت ہے۔آگ کی حرارت اور پانی کی برودت سے بھی زیادہ محکم وغیر مبدل ہے اور صرف عالم حیوانات ہی میں نہیں بلکہ کارخانہ ہستی کے ایک ایک وجود اور ایک ایک ذرہ تک میں جاری وساری ہے۔ (خطبات آزاد، صفحہ ۸۸۔۸۷)

سچا جوش اور محکم ولولہ:

جب کبھی انسانوں کے دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی عزت کے لیے باہم مل جاتے ہیں اور اپنے اندر سچا جوش اور محکم ولولہ پیدا کر لیتے ہیں۔ تو پھر ان کی محیر العقول اور مافوق العادۃ قوتوں کے معجزات و خوارق کا ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ و فی ذالك فلیتنا فسِ المُتنا فسون وان فی ذلك لایٰتِ و ما یعقلها الا العالمون۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۹۔۱۰۸)

حسن عمل:

حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے۔ سب کو اس کا لوہا ماننا پڑے گا۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۸۳۲)

اخلاص عمل:

رابعہ بصریہ پہلے طبقہ کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں۔ دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی مسیحی میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا۔ دوسرے میں پانی کا کوزہ۔ لوگوں نے پوچھا کہاں جارہی ہو۔ جواب میں بجنسہ وہی بات کہی جو لاریبتیاں نے دمشق کی عورت کی زبانی نقل کی ہے "آگ سے جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں۔ پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینی چاہتی ہوں۔ تاکہ دونوں ختم ہو جائیں، اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خدا کے لیے کریں۔ جنت اور دوزخ کے طمع و خوف سے نہ کریں۔

(غبار خاطر، صفحہ ۱۶۹)

مسلمان اور عمل:

مسلمانوں نے یا تو احکام قرآن کی تعمیل یک قلم ترک کر دی ہے یا پھر عمل بھی کر رہے ہیں تو اس طرح کہ فی الحقیقت عمل نہیں کر رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۴۴۵)

عمل کے لیے علت ـــــ نفع بخشی یا ضرر رسانی:

تمہارے عمل کے لیے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے

ہو تمہارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ اپنے کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۶۳)

تضاد عمل:

حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت واتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں؟

(خطبات آزاد، ص ۳۰۲)

استقامتِ عمل کا اعتماد:

سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں، بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دنیا سے لی ہیں۔ اس نکتے کو خانخاناں نے سمجھا تھا:

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست
نگاہ اہل محبت تمام تر گندست

(مضامین ابوالکلام آزاد / ۲، بدرالحسن، ص ۲۹۵)

نظریہ و عمل کی دنیا اور میانہ روی کی سعادت:

نظریہ اور عمل کی دنیا میں انسان انتہا پسند واقع ہوا ہے شاذونادر ہی میانہ روی کی سعادت اسے نصیب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس منزل میں ہر گام پر لغزش قدم کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس گھڑی کی سی ہے جس کا ریگولیٹر خراب ہو گیا ہے۔ اس کی رفتار بہت تیز ہے یا بہت ست، اس کا وقت کبھی درست نہیں رہتا۔

(پٹنہ یونیورسٹی میں تقریر، دسمبر ۱۹۴۷ء)

خود احتسابِ عمل:

یہ ہماری کیسی نادانی ہے کہ ہم اپنے اعمال کی کتابت کراماً کاتبین کے ذمے چھوڑ دیتے ہیں، پر خود کبھی اپنے اعمال کا احتساب نہیں کرتے؟ بہتر ہے کہ انسان خود ہی اس خدمت کو اپنے ذمے لے لے، اور قبل اس کے کہ "رقم کشان یمین ویسار" اس کا نامہ اعمال

اس کے سامنے لائیں، چند لمحوں کے لیے خود ہی اپنے اوپر ایک نظر احتساب ڈال لے اور اپنے ضمیر کو مخاطب کر کے کہے:

اقرا کتابك کفیٰ بنفسك الیوم علیك حسیبا۔ (۱۷:۱۵)	اپنے اعمال کی اس کتاب کو پڑھ لے آج کے دن کسی دوسرے کاتب و شاہد کی ضرورت نہیں خود تیرے ضمیر ہی کا احتساب تیرے لیے کافی ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۴۵)

زندگی کی مشکلات:

اے بے خبرو! یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے، کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسان ہی کے لیے ہیں۔ ایک بے روح لاش کے لیے نہیں ہیں۔ آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے۔ بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی، پر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضرور ہے۔ (مضامین ابوالکلام، حصہ اول، ص ۲۱)

میدان جنگ اور زخم کا خوف:

شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو اور تلووں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے تو ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

(افکار آزاد، ص ۱۲۸)

طلب و سعی:

طلب و سعی کی زندگی بہ ذات خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۸۰)

شرط کامیابی:

زندگی کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کر لیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و واقعات کے حوالے نہ کر دیا جائے۔

(ابوالکلام آزاد، آثار و افکار، ص)

نیت اور عمل:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا کی ہیں، دماغ دیا ہے، جو ارادہ کرتا ہے اور اعضاو جوارح دیے ہیں جو اس ارادے کو فعل میں لاتے ہیں پس ہر انسانی عمل کی کامیابی کے لیے قدرتی طور پر دو باتیں ضروری ٹھہریں:

ارادے کا صحیح ہونا اور

فعل کا صحیح طریق پر انجام پانا۔

دنیا کا کوئی عمل نہیں جو ان دو شرطوں کے بغیر وجود میں آسکے علوم وفنون واخلاق میں ان ہی دو حقیقتوں کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے، عزم، منصوبہ، تصور، اعتقاد وغیرہ“ سب سے وہی حقیقت مراد ہے، جو افعال سے پہلے وجود میں آتی ہے اور افعال کے لیے بہ منزلہ ٔعلت وسبب کے ہوتی ہے۔ جب تک وہ صحیح نہ ہوگی، فعل بھی صحیح نہیں ہو سکتا!...

اسی حقیقت کو شریعت نے ایک جامع اصطلاح میں نیت اور عمل سے تعبیر کیا ہے اور تمام ایمانیات اور عبادات کو ان ہی دو حقیقتوں کی تصحیح واصلاح سے مرکب کیا ہے۔ نیت دماغ کا ارادہ اور دل کا یقین واعتقاد ہے اور عمل اس کا ظہور ہے، جو ظاہر میں مرتب ہوتا ہے۔ پس شریعت بتلاتی ہے کہ تمام کاموں کی کامیابی کیلیے پہلی شرط نیت کی تصحیح اور درستگی ہے۔ یہی اصلی جڑ ہے باقی سب شاخیں!

(خطبات آزاد، ص۸۸۔۸۷)

بے عملی کا تعطل یا خود فراموشی کی موت:

ملک کی سیاسی جدوجہد کا قافلہ رواں ہے اور اس کا مطلب ہے کہ رشتہ ٔاقتدار اجنبیوں کی جگہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئے۔ اب مسلمان اپنے طرز عمل کا مقدمہ یوں ترتیب دیں کہ انہیں اپنے مستقبل کی طرف سے خطرہ ہے۔ یعنی اگر اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھ آیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اکثریت کے ہاتھ آیا اور مسلمان مارے گئے۔ پس وہ سیاسی جدوجہد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ہاں! شریک ہو سکتے ہیں، اگر انہیں خطروں کی طرف سے مطمئن کر دیا جائے۔ یہ اطمینان انہیں کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ اس طرح کہ کانگریس اطمینان دلادے، مگر کانگریس نے اطمینان دلا دیا اور کوئی

تجویز پاس کر دی تو پھر وہ جوق در جوق شریک ہو جائیں گے۔

اس صورت سے بلا شبہ مجھے اختلاف ہے۔ اختلاف ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں کسی ایسی صورت کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں نے جوں ہی معاملے کو اس شکل میں دیکھا، انھوں نے اپنی ہستی کو فنا کر دی۔ انھوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ مستقبل میں اپنے مفاد کے لیے خود اپنے پر اعتماد نہیں رکھتے۔ دوسروں کے سہارے جینا چاہتے ہیں۔ اور یہی تسلیم کر لینا سم قاتل ہے۔ کیا آٹھ کروڑ انسانوں کے لیے جن کی تیرہ صدیوں کی تاریخ ابھی تک دنیا نے فراموش نہیں کی۔ اس سے زیادہ کوئی توہین و تذلیل ہو سکتی ہے کہ وہ کانگریس سے یا کسی اور ملکی انجمن سے اس کے خواہش مند ہوں کہ ہمارے جی کا ڈر نکال دو تو ہم آزادی کی راہ میں جنبش کریں۔

اگر مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو نہ شریک ہوں، یہ بے عملی کا تعطل ہو گا، خود فراموشی کی موت نہیں ہو گی، لیکن اگر انھوں نے معاملے کو اس شکل میں دیکھ کر قدم اٹھایا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں خود اعتمادی اور پامردی کی جگہ کھو دی۔ یہ جماعتی زندگی کی موت ہے اور جب موت ایک مرتبہ آجاتی ہے تو پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔

(نوادرِ ابوالکلام، ص ۲۳۔۲۱)

امید ـــــ اسلام کا عطیہ عظیم:

پھر یہ ممکن ہے کہ اس کائنات ارضی کا ہر مخلوق ناامید ہو جائے۔ یہ بھی محال نہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسانی جماعتیں مایوسی کو اپنا قبلۂ مقصود بنا لیں لیکن جن لوگوں کے دلوں کو اسلام کی امانت سپرد کی گئی ہے وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اسلام سرتاسر امید ہے وہ جب کبھی کسی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے وہ امید ہی ہے اس کی اصطلاح میں ایمان، امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبدا ہے۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۸۴)

مایوسی کی نظر اور امید کا مذہب:

دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لیے دو طرح کی نظریں رہی ہیں ایک امید

کی اور دوسری مایوسی کی۔ حکمائے یونان کی نسبت سنا ہوگا کہ آثار و نتائج عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب امید اور مایوسی کے تھے۔ پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے، وہ اسی رنگ میں نظر آئے گی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اُس کے دلائل بے شمار ہیں اور امید کا مذہب اختیار کرو تو اس کے پہلو مایوسی سے کم نہیں۔ اسلام ہم کو ہمیشہ امید کی تلقین کرتا ہے، پس کیوں نہ ہم امید کے پہلوؤں ہی پر نظر ڈال لیں؟

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۵۶)

یاس واضطراب:

یاس واضطراب کا لشکر جب آتا ہے تو اُس کا پہلا حملہ عقل و دماغ پر ہوتا ہے لوگ حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور مایوس ہیں کہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ مرحوم غالب نے اسی عالم کی تصویر کھینچی ہے:

فرصت زدست رفتہ وحسرت فشردہ پائے
کاراز دوا گذشتہ و افسوں نہ کردہ کس

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ اول، صفحہ ۴۳)

مایوسی کی ہلاکت اور امید کا فرشتہ:

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لیے قاتل و مہلک نہیں، اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی قہاری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اُس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اسکے کناروں کو میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے، پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بستر مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے، ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جب کہ قوتیں جواب دیدیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے۔ جبکہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی، اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دیدیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے، جو مسکراتا ہوا آتا ہے۔ اپنے پروں کو کھولتا ہے، اور اس کے سایہ میں لے کر

قوت و طاقت، ہمت و مستعدی، چستی و چالاکی کی ایک روح تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے!

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لیے پہلی چیز امید ہے جبتک انسان کے اندر امید قائم ہے، مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر عفریت بھی سامنے آ کھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لیے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی وادبی حیات کیلیے امید اس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے۔ جب تک اس کا دوران دل سے اٹھ کر یا باصطلاح حال دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارت عمل پیدا کر رہا ہے۔ اس کی قوت عمل زندہ اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تگاپو ہیں۔ لیکن جہاں روح حیات دل سے نکلی، پھر جسم انسانی کے لیے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۴۹)

بہار و خزاں اور امید و بیم:

جذباتِ انسانی کی تحلیل و تفرید کے آخری عناصر یہی دو چیزیں امید اور حسرت نظر آئیں گی وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے اور یا رفتہ پر حسرت البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجیے، بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور اپنی اپنی آمد کے متضاد و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں، اسی طرح امید و حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں، اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے۔ اور بعض ہیں جو اب صرف یاس و حسرت کے خزاں ہی کیلیے رہ گئے ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دورِ امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لیے ایک بہشتِ امید بن جاتی ہے۔ اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لیے ایک ترانہ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر

نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زارِ ہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاق مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصر نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجیے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور آپ کے لیے ظلمت سرائے تاریک ہے۔

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے اس لیے جہاں جاتے ہیں اقبال و کامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے چونکہ ان کے دل کے اندر سلطانِ امید فتحیاب ہوتا ہے۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۶۳ـ۶۲)

اسلام اور امید:

اسلام سرتاسر امید ہے۔ وہ جب کبھی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے وہ امید ہی ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں ایمان امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبدا ہے۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۸۴)

مایوسی ـــــ سب سے بڑا کفر:

تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم مایوس ہو رہے ہو۔ اور کیوں تم نے خدا کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ اب ہمارے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ایک مسلم کے لیے ناامیدی سے بڑھ کر کوئی کفر نہیں ہے۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۷۱)

یاس کا سکون:

انسان کی ساری مصیبتیں اس کی امید پرستی کا نتیجہ ہیں۔ اور فی الحقیقت یاس میں کامیابی سے بھی بڑھ کر سکون ہے۔

(الہلال [کلکتہ]، ج ۱، صفحہ ۲)

امید ـــــ اسلام کا عطیہ:

یہ ممکن ہے کہ اس کائناتِ ارضی کا ہر مخلوق ناامید ہو جائے۔ یہ بھی محال نہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسانی جماعتیں مایوسی کو اپنا قبلۂ مقصود بنالیں لیکن جن لوگوں کے دلوں کو اسلام کی امانت سپرد کی گئی ہے وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اسلام سرتاسر امید ہے وہ جب کبھی کسی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے وہ امید ہی ہے۔ اس کی اصطلاح میں ایمان، امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبدا ہے۔ (مقالات آزاد، ص ۳۴)

امید ـــــ زندگی کی علامت:

قوموں کی زندگی کی بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل امید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے۔ اور خواہ ناکامی و مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر امید کا طائر مقدس اُن کے دل کے گوشے سے نہیں اُڑتا۔ وہ دنیا کو ایک کارگاہِ عمل سمجھتے ہیں امید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے ہی لیے ہے اگر آج تم اس پر قابض نہیں ہو تو غم نہیں کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے۔ (مقالاتِ آزاد، ص ۷۵)

اسلام کا فلسفۂ امید و یاس:

دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لیے دو طرح کی نظریں رہی ہیں۔ ایک امید کی اور دوسری مایوسی کی۔ حکمائے یونان کی نسبت سنا ہوگا کہ آثار و نتائج عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب امید اور مایوسی کے تھے۔ پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے وہ اسی رنگ میں نظر آئے گی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اس کے دلائل بھی بے شمار ہیں اور امید کا مذہب اختیار کرو تو اس کے پہلو بھی مایوسی سے کم نہیں اسلام ہم کو ہمیشہ امید کی تلقین کرتا ہے۔ پس کیوں نہ ہم امید کے پہلوؤں ہی پر پہلے نظر ڈال لیں۔

(مقالاتِ آزاد، ص، ۸۱)

امید کی زندگی اور مایوسی کی خودکشی:

خدا کی رحمت اور دنیا کی زندگی صرف امید رکھنے والوں کے لیے ہے اور مایوسی کا نتیجہ موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تم کو نہیں چھوڑتا پر تم اُسے چھوڑ رہے ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھتا لیکن تم نے ناامید ہو کر اُس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ تم کو معلوم نہیں کہ یہی

مایوسی ہے جس کو تمہارے خدا نے کفر کی خودکشی سے تعبیر کیا ہے! (مقالاتِ آزاد، ص ۸۰)

امید اور قومی زندگی:

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر فرد ایک پیکر اُمید ہوتا ہے، اور اپنے دل کو امید کی جگہ سمجھتا ہے نہ کہ مایوسی کی لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زندہ قوموں کے لیے مایوسی کے اسباب ہی میں زندگی کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی بڑھتی ہیں اتنی ہی وہ اپنی اُمید کو اور زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں۔ مصیبتیں اُن کو مایوس نہیں کرتیں بلکہ غفلت سے ہشیار کر دیتی ہیں اور عبرت و تنبیہ کی صورت میں ان کے سامنے آتی ہیں۔ وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ کر بھاگتے نہیں بلکہ اس راہ کو ڈھونڈھ کر بند کرنا چاہتے ہیں جہاں سے اس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہے۔ (افکارِ آزاد، ص ۲۹۔۱۲۸)

امید اور مایوسی:

انسان کا فرض سعی و تدبیر ہے اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے اس کو سعی و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے۔ ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر بھی جواب دے دیتے ہیں۔ تاہم سعی و علاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے۔ جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے تو تعجب ہے کہ قوم و ملت کے ساتھ نہ ہو؟ کس کو معلوم ہے کہ کب دروازۂ رحمت کھلنے والا ہے، اور کب بارش ہونے والی ہے؟ دہقان کا کام صرف یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے۔

چوں دمبدم عنایتِ توفیق ممکن است
در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

(افکارِ آزاد، ص ۳۱۔۱۳۰)

امید و بیم:

انسان شاید یاس و امید کے بارے میں کچھ فطرتاً عاجل ہے۔ اس کی فطرت سادہ، بچوں کی مثال سے واضح ہوتی ہے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ ہر حالت کا اثر بغیر تفکر و تدبر کے دفعۃً قبول کر لیتے ہیں۔ روتے ہوئے بچے کو مٹھائی کا ایک ٹکڑا پکڑا دیجیے تو ہنسنے لگتا ہے اور چھین لیجیے تو فوراً مچل جاتا ہے۔

بعینہ یہی حال عقل وفکر کے نشو ونما کے بعد بھی انسان کا ہوتا ہے۔البتہ تاثر و نتائج تاثر کی صورت بدل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی فطرتِ انسانی کی عجلت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔جب کہ کہا ہے کہ خلق الانسان من عجل۔انسان کی فطرت میں جلد بازی اور تعجیل کا رہے۔

مصائب کے حس اور شادمانی کے غرور میں بھی دیکھیے تو اس کی یہی جلد بازی وزود اثری ہر موقعہ پر کام کرتی ہے۔وہ کس قدر جلد غمگین ہو جاتا ہے اور پھر ایک روتے ہوئے بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا دے دیا گیا ہو کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے اس کی مایوسی اور امیدواری دونوں کا یہ حال ہے۔جب کبھی وہ اپنی کسی توقع میں ناکامی دیکھتا ہے تو فوراً مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے اور پھر جب کبھی کوئی کامیابی کی خبر سن لیتا ہے تو امید و مسرت کے ضبط سے عاجز ہو کر اچھل پڑتا ہے۔حالانکہ نہ تو اس کو ان اسباب کی خبر ہے جو غم و نامرادی کے پیچھے ظاہر ہونے والے ہیں اور نہ ان عواقب و نتائج کی خبر ہے جو بشارتِ امید کے بعد پیش آنے والے ہیں۔اس کی خدا پرستی بھی اس جلد بازانہ یاس و بیم سے شکست کھا جاتی ہے۔اگر کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو سمجھتا ہے کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔اور اگر نتائج حالات اور مشیت الٰہی کسی ابتلا و مصیبت میں ڈال دیتی ہے تو دیوانہ وار مایوس ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھ کو چھوڑ دیا۔سورۃ الفجر میں اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور تمہارے اندر وہ کون سی شے ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ نہیں کیا؟" (مقالات آزاد، ص ۷۳۔۷۲)

امید ـــــ کامرانیوں کی بنیاد:

سب سے زیادہ خطرناک مرض انسان کی وہ مایوسی ہے۔جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھکر اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لیے نامرادی وناکامی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لیے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ (مقالات آزاد، ص ۷۳)

امید اور کامیابی:

قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل امید کا دائمی آشیانہ

ہوتا ہے، اور خواہ ناکامی و مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر امید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشہ سے نہیں اڑتا۔ وہ دنیا کو ایک کارگاہ عمل سمجھتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر آج تم اس پر قابض نہیں ہو تو غم نہیں کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے۔ (افکار آزاد ص ۱۲۷)

امید کا جنازہ اور مایوسی کا لشکر:

لیکن اسی طرح قومی زندگی کے ایام ممات اور انسانی ارتقائے حیات کا سدباب اس دن سے شروع ہوتا ہے، جس دن کا شانۂ دل سے امید کا جنازہ اٹھتا اور مایوسی کا لشکر فنا امنڈتا ہے۔ جس فرد یا جس قوم کو مصیبتوں اور ناکامیوں کے عالم میں مایوس دیکھو، یقین کرو کہ اس کا آخری دن آگیا۔ مصیبتیں تو اس لیے تھیں تاکہ غفلت کو شکست اور ہمت کو تقویت ہو لیکن جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں دنیا کے اعمال و تدابیر کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہمارے لیے دنیا میں کچھ نہیں رہا وہ تو خود اپنے لیے زندگی کے بدلے موت کو پسند کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی کامیابی زندگی کو لڑ کر لینے والوں کے لیے ہے مٹ جانے کے متلاشیوں کے لیے نہیں ہے۔ (افکار آزاد، ص ۳۰۔۱۲۹)

جذبات ــــــ اہمیت اور ہلاکت:

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں۔ نہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جا سکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرایور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اس کی طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی۔ وہ ٹرین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے، مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے!

"جذبات" اسی وقت کام دے سکتے ہیں، جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم وقضاء کے لیے "ادراک" اور "دماغ" بھی موجود ہو۔ وذلك من عمل النبوة، ولكن لا يعقلها الا العالمون۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۵۱۔۱۵۰)

جذبہ رقابت:

جذبۂ رقابت و غبطہ و رشک عورتوں کی طبیعت میں داخل ہے اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں رشک کا قدم ضرور آتا ہے۔ باسایہ ترا نمی پسندم۔

(ایلاو تخییر۔ ص ۸۳)

واقعات کی دنیا:

واقعات کی دنیا جذبات کے عالم سے مختلف ہوتی ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۲۲۲)

رشک —— ایک فطری جذبہ:

رشک اور غیرت محبت جنس اناث کا وہ فطری جذبہ ہے، جس کے آگے کسی جذبے کی نہیں چلتی۔

(ایلاو تخییر۔ ص ۳۲)

اصلی عیش:

انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغؔ مرحوم نے ناصح سے صرف اُس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے

(غبار خاطر، صفحہ ۹۸)

راحت والم:

زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صورت گری ہے؟ یہاں نہ مطلق راحت ہے۔ نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سرتا سر اضافی ہیں:

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن ومُردن!

اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت والم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی

ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جاسکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں، اُس سے فنون لطیفہ کے ایک ماہر کا معیار راحت والم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی دان کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذت ملتی ہے۔ وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکے گی۔

(غبار خاطر، ص۶۹)

عوام کی حالت اور خواص کی ذمہ داری:

عوام کے احساسات فکر و دماغ پر مبنی نہیں ہوتے، جس میں فہم و مصلحت شناسی کی گنجائش ہو۔ وہ تو جذبات و عواطف کی مخلوق ہیں۔ چلنے کی جگہ بہتے ہیں رکنے کی جگہ گر جاتے ہیں۔ محبت و عقیدت پر آئیں گے تو پوجنے لگیں گے، بے میل ہوں گے تو نفرت کرنے لگیں گے۔ اعتدال اور میانہ روی اس مخلوق میں نہیں ہوتی۔ مشہور فرانسیسی کاتب وکٹر ہیوگو کے لفظوں میں "یہ مخلوق آگ کی طرح بھڑکتی ہے اور راکھ کی طرح ڈھیر ہو جاتی ہے۔" یہ خواص اور قائدین امت کا کام ہے کہ اس کے نبض شناس ہوں اور ہمیشہ اس کی لگام مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اگر کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے عام جذبات میں ہیجان وانفجار کا اندیشہ ہو تو چاہیے کہ پوری طرح حزم واحتیاط سے کام لیں۔ ہر لفظ تول کر اور ہر خیال پیمانے میں ناپ کر زبان سے نکالیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود بدحواس نہ ہو جائیں۔ اگر وہ بدحواس ہو کر چیخ اٹھیں گے تو پھر عوام کے لیے یہی رہ جائے گا کہ پاگل ہو کر کپڑے پھاڑنے لگیں!

(تبرکات آزاد، صفحہ ۲۴۹۔۲۴۸)

سب سے بڑی آزمائش:

لیکن چونکہ معاملہ نہایت نازک تھا۔ محبوب ومطاع کی محبت و تعظیم اور مبغوض ومطرود سے بغض واستکراہ طبیعت انسانی کا قدرتی مقتضا ہے اور چونکہ نوع انسانی کے لیے راہ عمل کی سب سے بڑی آزمائش اسی میں ہے کہ فطری امیال وجذبات میں عدل واعتدال ملحوظ رکھا جائے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۳۱۹)

عدل واعتدال:

نوع انسانی کے لیے راہ عمل کی سب سے بڑی آزمائش اسی میں ہے کہ فطری امیال

وجذبات میں عدل واعتدال ملحوظ رکھا جائے۔

(تبرکاتِ آزاد، صفحہ ۳۱۹)

نفس وجذبات کی آزمائش:

تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش تو نفس وجذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوت ایمانی واحسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔

(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، ص..)

نفس وشیطان کا فریب:

ایک دنیادار فاسق اور ایک دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ پہلا اپنی ہوا پرستیوں کو اعترافِ فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے اور دوسرا دینداری اور احتسابِ شرعی کی ظاہر فریبی سے:

تا بغایت ما ہنر پندا شتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بردہ است

نفس وشیطان کے خدع وفریب کے کاروبار بہت وسیع ہیں۔ لوگوں نے ہمیشہ اس کو میکدوں ہی میں ڈھونڈھا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں ڈھونڈھتے تو شاید جلد پتا لگ جاتا!

یارب زسیل حادثہ طوفاں رسیدہ بود
بت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند!

(تذکرہ، صفحہ ۶۴)

انسان کا نفس خادع:

انسان کی اس غلطی پر، جو شاید اس کی فطرۃ میں داخل ہے، ہمیشہ ماتم کیا گیا ہے اور کیا جائے گا کہ وہ اپنے رازوں کو اُن سے چھپاتا ہے ان کے ہاتھ میں اُس کی جزاوسزا نہیں، پر اُس کی بالکل پروا نہیں کرتا جو اس کی جزاوسزا پر تنہا قادر ہے اور اس کے تمام چھپے ہوئے کاموں پر سے عاقبت کا پردہ اٹھا دینے والا ہے؟ یہ نادان لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے نفس خادع نے خود ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، ص ۴۴)

انسانی نفس کی کمزوریاں اور اہل ہمت:

انسان اپنے اندر اور باہر کے جن حالات کو مجبوریوں سے تعبیر کرتا ہے، فی الحقیقت اس کے نفس کی کمزوریاں ہی ہیں۔ دنیادار العمل ہے اور جو کام کرنے والے ہیں وہ باغ وچمن کے گوشوں ہی میں نہیں بلکہ کانٹوں پر چل کر بھی کام لیتے ہیں۔ خدا نے ہم سے کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے کہ وہ ہمارے وہم وخیال کے پیدا کیے ہوئے اسباب راحت ضرور مہیا کر ہی دے گا، زندگی ایک میدان جنگ اور یہاں کام کرنے کے یہی معنی ہیں کہ تلواروں کے سائے اور نیزوں کی قطاروں کے نیچے رہ کر کام کیا جائے دریا کی موجوں میں سے تیرنے والے اپنی راہ پیدا کر لیتے ہیں، لیکن کنارے کے عافیت پسندوں کے لیے انتظار کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۵۳۔ ۵۲)

اظہار رائے:

بلاشبہ ہر دیانت دار انسان کا فرض ہے کہ اپنی رائے میں جو بات صحیح سمجھتا ہے، اس پر پوری طرح زور دے اور دلائل سے اس کی قوت ظاہر کرے۔ لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں کسی ذرا سی بات میں اختلاف ہوا اور ہماری بات نہ چلی فوراً قلم اٹھایا اور قوم کی تباہی وبربادی اور مخالف رائے رکھنے والوں کی ایمان فروشی کا اعلان کر دیا۔

(افکار آزاد، ص۱۶۔ ۱۵)

عقل ودماغ یا اشتعال وانفعال:

میں اس موقعہ پر اس بات کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جذبات وتاثرات کی یہی وہ بے لگام افراط وتفریط ہے۔ جس نے آج برسوں سے ہماری پبلک لائف تہ وبالا کر رکھی ہے۔ "جو لوگ جماعتی کاموں میں حصہ لے رہے ہیں، ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے جوش میں آنا اور جوش دلانا تو سیکھ لیا ہے۔ لیکن محل اور مقدار کا سوال ان کے لیے بالکل غیر ضروری ہے اگر ان کی دماغی ساخت کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے تو اس گھڑی میں ٹک ٹک کرنے کے تمام پرزے موجود ہیں مگر ریگولیٹر کی جگہ خالی رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی قوم محض چند انسانوں کی بے لگام اثرپذیریوں کے رحم پر ہے۔ جہاں کسی نے کسی مہمل اور لغو بات پر جشن وکامرانی کا غلغلہ بلند کر دیا، لوگ جوش مسرت میں بے خود ہو کر ناچنے

لگے۔ جہاں کسی نے کسی فضول سی بات پر بربادی وہلاکت کا ماتم شروع کردیا، لوگ لگے دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹنے۔ خوشی کی بات ہو یا غم کی اس بازار میں من سے لیکر چھٹانک تک ہر بٹہ کا ایک ہی وزن ہے۔

(افکار آزاد، ص ۱۷)

حیلہ بازی:

یاد رکھنا چاہیے کہ احکام شرع کی تعمیل میں اس طرح کی حیلہ بازیاں نکالنی فسق و ضلالت کا انتہائی مرتبہ ہے۔ اور جو شخص اس طرح کی مکاریاں کر کے احکام الٰہی سے بچنا چاہتا ہے، اس کی معصیت ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ ہے، جو سیدھی سادی طرح ترک اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ ایک شخص سے جرم ہو گیا۔ محض جرم ہے۔ مگر یہ بات کہ ایک شخص جرم کو بے جرمی و پاک عملی بنا کر کرتا ہے، صرف جرم ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور صرف اس کی عملی زندگی ہی کو نہیں بلکہ ایمان و فکر کو بھی تاراج کردینے والا ہے۔
(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۳۳-۴۳۲)

حیلہ جوئی و بہانہ سازی:

افسوس! حیلہ جوئی و بہانہ سازی کا نام تمہاری بولی میں رخصت ہے، اور ہمت کی موت اور ایمان کی جان کنی کو تمہاری بستی میں مصلحت بینی اور دانشمندی کے لقب سے پکارا جاتا ہے! تم کو اس عالم کی کیا خبر؟ اقلیم عزائم اور ہمت آبادِ عشق کے معاملات تمہارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہیں۔ تمہارے لیے یہی بہت ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ایمان کی بچی بچائی اور بچی کھچی پونجی بچالے جاؤ۔ اگرچہ اس کی بھی امید نہیں:

توائے گرد توہم! شوکت دریا چہ میدانی؟
اسیر عذر لنگی وسعتِ صحرا چہ میدانی؟

تم کہتے ہو کہ دیدہ و دانستہ اپنی جان ہلاکت میں ڈال دینا کون سی عقلمندی اور کہاں کی حق پرستی ہے؟ بلکہ ایک طرح کی ضلالت و جنون تو تمہاری مثال ٹھیک لائماتِ مصر کی سی ہے، جو جمال عصمتِ یوسفی سے بے خبر امراۃ العزیز کو ملامت کیا کرتی تھی، لیکن کاش ایسا ہو تا کہ پردہ اٹھایا جا سکتا تو اس وقت ملامت گراں بے درد پر اپنی ملامتوں کی حقیقت کھلتی،

لامات مصر نے تو صرفِ ہاتھ ہی کاٹ لیے تھے، لیکن عجب نہیں کہ تمہارے ہاتھوں کی چھریاں خود تمہاری ہی گردنوں پر چل جاتیں۔

(تذکرہ، صفحہ ۴۶۔۱۴۵)

صداقتِ حیات:

صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان!

(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، صفحہ ....)

مطلوب نفس کی حقیقت:

زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوباتِ نفس وہم وخیال سے زیادہ نہیں۔

(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، ص...)

نفس وجذبات کی آزمائش:

سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا۔ پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا، درندوں کے مقابلے سے منہ نہیں موڑتا، تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۴۴۔۸۴۳)

زندگی کی سب بڑی لذت:

راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لا کر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب وسعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے، بشرطیکہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

رہرواں راخستگی راہ نیست
عشق ہم راہست وہم خود منزل ست!

(غبار خاطر، ص ۷۰)

اختلاف رائے یا معاندانہ مخاصمت:

جب کبھی اختلاف رائے معاندانہ مخاصمت اختیار کر لیتا ہے تو کس طرح حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور جو چیز ایک شخص کی نظروں میں سفید ہوتی ہے وہ دوسرے کو سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عقل و دماغ کی جگہ سرتاسر جذبات کی مخلوق ہے۔

(افکار آزاد، ص ۴۲)

جذبات:

"جذبات" اسی وقت کام دے سکتے ہیں جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم و قضا کے لیے "ادراک" اور "دماغ" بھی موجود ہو۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، ص ۲۱۰)

جوش اور غصہ:

مصیبت یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جوش اور غصہ کا باہمی فرق بہت ہی خفیف رہا ہے:

ہردم آزردگیٔ غیر سبب را چہ علاج؟
ما گزشتیم زلطف تو غضب را چہ علاج؟

(افکار آزاد، ص ۱۰)

عشق الٰہی کی پہلی شرط:

عشق الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پاگل ہے کہ جب تک دل پر درد کی کوئی محکم چوٹ نہ لگے ادھر سے ٹوٹ نہیں سکتا، مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اڑائیے نہیں، نہیں اڑتی۔ انسان کا دل جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق ہی کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دلفریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقہ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی

درد کے لیے عارف عطار بیقرار و فغاں ساز ہے کہ:

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردے دل عطار را

(مضامین ابوالکلام آزاد، ص ۲۱۸)

رحمٰن ورحیم کا عشق:

تمہارے خدا نے تمہارے ساتھ کون سی برائی کی تھی کہ تم نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اُسے چھوڑ کے کون سی دولت و نعمت ہے جو تمہیں ہاتھ آگئی؟ خدا سے بڑھ کے وہ اور کون حسین ہے جس کے حسن نے تم کو خدا سے چھین لیا؟ اور اس سے بڑھ کر کس کے پاس محبت اور پیار ہے جس کی زنجیریں تمہارے پاؤں میں پڑ گئیں؟ تم غیروں کے پاس جاتے ہو تاکہ ٹھوکریں کھاؤ پر خدا کے پاس نہیں دوڑتے تاکہ وہ تمہیں پیار کرے؟

اگر تم محبت کے بھوکے ہو تو "الرحمن الرحیم" سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے عشق میں اسے چھوڑ رہے ہو؟ اگر تم رزق کے بھوکے ہو تو "رب العالمین" سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے خزانوں کی لالچ نے تم کو متوالا کر دیا ہے؟ اگر تم اپنی محنت کی مزدوری مانگتے ہو تو "مالك یوم الدین" سے بڑھ کر اور کون مل گیا ہے جو تمہیں بدلہ دے گا؟

(افکار آزاد، ص ۸۷۔۸۶)

خدا کی محبت:

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اُسے نہ دو گے اور اپنی جانوں کو اس کی محبت سے بھی زیادہ پیارا سمجھتے ہو کہ اس کے لیے دکھ میں نہ ڈالو گے۔ اور اگر تمھارے دلوں کی آہیں تمہارے جگر کی ٹیس اور تمہاری آنکھوں کے آنسو اب اسکے لیے نہیں رہے ہیں بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں، تو یقین کرو کہ وہ بھی تمہارا محتاج نہیں ہے اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے۔

وہ اگر چاہے گا تو اپنے کلمۂ حق کی خدمت کے لیے درختوں کو چلا دے گا، پہاڑوں کو متحرک کر دے گا، کنکروں اور خاک کے ذروں کے اندر سے صدائیں اُٹھنے لگیں گی۔ پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی بھی کام نہ لے گا۔ اور اپنے پاک کام کی عزت کو ناپاکوں کی

گندگی سے کبھی آلودہ نہ ہونے دے گا۔ اور پھر تم مانو یا نہ مانو مگر میں نے سچ مچ دیکھا کہ جب تمھارے اندر سے اس کی پکار کو جواب نہ ملا تو وہ دوسروں کو پیار اور محبت کے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا ہے۔

(افکارِ آزاد، ص ۹۱۔۹۰)

محبت الٰہی کی شرط اول:

خدا نے اپنی محبت کی پہلی شرط یہ قرار دی کہ لن تنالو البرحتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس کی راہ میں ان چیزوں کو نہ لٹا دو جو تم کو محبوب و مطلوب ہیں، کیونکہ ایک دل میں محبت کے دو آشیانے نہیں بن سکتے، انسان کی دنیوی محبوبات میں مال و متاع، اہل و عیال، اور پھر نفس و جان، یہی تین چیزیں وہ سب سے زیادہ بوجھل زنجیریں ہیں جو اس راہ میں پاؤں کو ہلنے نہیں دیتیں، اس فانی فی اللہ عاشق صادق نے ایک ہی وقت میں ان تینوں منزلوں کو طے کر لیا، سب سے پہلے مال و متاع کو اس کی راہ میں لٹایا، پھر اپنے عزیزوں کو قربان کیا۔ آخر میں جان رہ گئی تھی، یہ بھی جان آفرین کے سپرد کر دی۔ لایؤمن احد حتیٰ احب الیہ من والدہ وولدہٖ والناس اجمعین۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند　　فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

(مقالات آزاد، ص ۱۶)

ایمان کے ساتھ نفس کا عشق:

اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہ رہی، لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا ڈر اور ایمان کے ساتھ نفس کا عشق بھی باقی ہے: ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا (۱۴۹:۴) اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں راہوں کے بین بین کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔ حالانکہ تیسری راہ اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں۔ راہیں صرف دو ہی ہیں۔ فمن شاء فلیؤ من، ومن شاء فلیکفر۔ حضرت مسیح نے کہا ہے: "ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا" قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے: ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ۔ (۴:۳۳) یعنی:

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ک)

محبت و تعظیم میں بے اعتدالی:

یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو برائی جس درجہ قوی و عام ہوتی ہے اتنی ہی قوت و شدت کے ساتھ اس کا دروازہ بھی بند کرنا پڑتا ہے۔ برائیوں کی اصلاح و انسداد میں شارع کے احکام و اعمال بھی اسی اصل پر مبنی ہیں۔ چونکہ محبت و تعظیم کا معاملہ انسانی قلب کے لیے نہایت نازک واقع ہوا ہے اور کوئی قوم راہِ توحید و دین الخالص سے نہیں بھٹکی مگر محبت و تعظیم کی بے اعتدالی سے۔ اس لیے اسلام نے اس کے انسداد میں بھی کمال شدت و اہتمام کیا اور ایک چھوٹا سا سوراخ بھی کہیں کھلا نظر آیا تو فوراً اسے بند کر دیا۔ یہی حال صحابہ کرام کا تھا۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۲۲۳)

محبت باطل:

دنیا میں محبت باطل سے بڑھ کر پائے حق کوش کے لیے کوئی سخت زنجیر نہیں کہ "حبك الشي يعمي ويصم" (حدیث صحیح) محبت باطل قبول حق سے آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیتی ہے۔

(الہلال، کلکتہ، ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۳۳۵)

دشمنوں کو پیار:

اخلاق کے سیکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی مسئلہ حب و بغض، تولا و تبرا، تحسین و تذلیل اور عفو و انتقام کا بھی ہے۔ ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے کہ دل کو محبت کے لیے مخصوص کر دو کہ اس گھر کے لیے یہی فانوس موزوں ہے۔ انیس سو برس پیشتر کا ایک اسرائیلی واعظ کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو، کیونکہ اگر صرف چاہنے والوں کو چاہا تو تمھارے لیے کیا اجر؟

(صدائے حق، ص ۲)

محبت کا لازمہ:

یاد رکھو کہ ہر محبت کے لیے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب

تک کہ متکبر و مغرور بھی نہ ہو۔ نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو بُرا کہنا ہی پڑے گا۔ اور خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی کی پرواہ مت کرو۔

(صدائے حق، ص۶)

عشق وخود پرستی:

عشق وخود پرستی دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ عشق کی تعریف یہ ہے کہ اولھاقتل وآخرھا حرق (اس کی ابتدا قتل نفس ہے اور انتہا تمام خواہشوں اور ہوا وہوس کا فنا) یہاں سب سے بڑی معصیت اپنے وجود کا حس اور اثبات ہے:

وجودك ذنب لا يقاس به ذنب

(صدائے حق، ص۲۹)

دوسر چشمۂ سعادت —— محبت حق اور خدمت خلق:

جس جگہ ہوں اور جس حال میں ہوں، محبت حق اور خدمت خلق میں مشغول رہیں۔ یہی دوسر چشمہ سعادت و وصول الی اللہ ہیں۔ محبت حق اس کے احکام کی اطاعت میں ہے اور خدمت خلق محتاج تشریح نہیں۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۹۵)

انسانیت اور عشق کا کلیسا:

دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے، جس کو پانی بنتے دیکھا ہے۔ مگر آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی۔ حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے اور عشق کا کلیسا آتش کدہ ہے۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں، جو اپنے دلوں کو اس آتش کدے پر نذر چڑھادیں اور پھر دامن سے ہوا دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے:

افسردہ را نصیب نہ باشد دل کباب
آں یابد ایں نوالہ کہ مہمان آتش است

(مضامین ابوالکلام آزاد، ص۲۱۷)

گمراہی کے دو بھیس: افراط بغض یا افراط محبت:

دنیا میں جس وقت سے نوعِ انسانی آباد ہوئی ہے، ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس

رہے ہیں۔ یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے:

ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

لیکن اہل حق کی صراطِ مستقیم ان دونوں سے الگ ہے:

میانِ کعبہ و بت خانہ راہیست!

وہ ہر حال میں احکام شریعت اور ظواہر کتاب و سنت کو مقدم رکھتے ہیں، اور اس تمام کائناتِ ہستی میں صرف انہی کو واجب الاطاعت یقین کرتے ہیں مگر ساتھ ہی تمام اہل علم وائمہ اسلام سے حسن ظن و عقیدت بھی رکھتے ہیں اور ان کے جو اقوال و آراء یا احوال و سوانح بظاہر نصوصِ کتاب و سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی وجہ سے یکا یک سرگرم انکار و تضلیل نہیں ہو جاتے، بلکہ حتیٰ الوسع ان کی تاویل کرتے ہیں اور ایسی راہِ تعبیر ڈھونڈھتے ہیں، جو نصوصِ شریعت کے مطابق ہو۔ اور اگر دیکھتے ہیں، کہ کسی طرح اختلاف دور نہیں ہو سکتا، تو ان کی خاطر نصوصِ شرعیہ کو اپنی جگہ چھوڑ کر ماؤل ہونے کی زحمت نہیں دیتے کہ یہی بنیاد تحریف ہے۔ بلکہ یا تو اُن عذرات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ اس اختلاف پر مجبور ہوئے۔ اور یا پھر ان کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر کے ان کا معاملہ عالم السرائر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مگر نہ تو اُن کی پیروی و حمایت کرتے ہیں اور نہ اُن کی وجہ سے صاحب قول و حال کے حقوق اسلامی و مراتب فضیلتِ علم و عمل نظر انداز کر کے آمادۂ انکار و تضلیل ہو جاتے ہیں، کیونکہ کسی غیر معصوم کا قابلِ احترام و اتباع ہونا اس کے لیے مستلزم نہیں کہ اُس کا ہر قول و حال حجت ہو، اور نہ کسی غیر معصوم کے کسی ایک قول و اجتہاد کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اُس کے تمام محاسن اقوال و اعمال کو ترک کر دیا جائے۔

(تذکرہ، صفحہ ۵۷-۵۶)

جوہر اخلاق اور اس کی نمائش:

اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون وارواح میں چھپی ہوئی ہے لیکن اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو وہ مشام جان کو معطر نہیں کر سکتا۔ اس کی بوئے جاں فزا بار بار کے ملنے ہی سے پھیلتی ہے۔ اسی طرح اگر انسان تمام دنیا سے الگ ہو کر ایک قلعہ کوہ پر عزلت گزینی اختیار کر لے تو اس کا اخلاقی جوہر ہمیشہ کے لیے پہاڑ کی تاریک غاروں میں چھپ جائے

گا۔ لیکن خدا نے انسان کو اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی بنا پر انبیاء علیہم السلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق قرار دیا۔ (افکار آزاد، صفحہ ۶۷-۲۷۵)

مرتبہ احسان:

عرفان حقیقت کے لحاظ سے گویا یہاں تین مرتبے ہوئے: پہلا مرتبہ اسلامی دائرے کے اعتقاد و عمل کا ہے، یہ اسلام ہے، یعنی جس نے اسلامی عقیدے کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی، وہ اس دائرے میں آگیا۔ لیکن دائرے میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم و یقین کے جو مقامات ہیں، وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا مرتبہ نمایاں ہوا جسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا۔ ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، عرفان حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اسے احسان سے تعبیر کیا گیا، لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے۔ جو ایک گروہ کو بہ حیثیت گروہ کے حاصل ہو جاسکتا ہے، یہ ذاتی تجربے کا مقام ہے۔ جو یہاں تک پہنچتا ہے وہ اپنے ذاتی تجربے و کشف سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیمی اور احکامی عقائد کو اس میں دخل نہیں، بحث و نظر کی اس میں گنجائش نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے، بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا، وہ اگر کچھ بتلائے گا بھی تو یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ، پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو۔

پرسید یکی کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو من شوی بدانی

(ترجمان القرآن، ا۔ صفحہ ۳۲-۳۳۱)

مرد اور عورتیں:

بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں، لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ سورہ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے، وہاں

صاف صاف تصریح کردی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے: ''للرجال نصیب مما اکتسبوا، وللنساء نصیب مما اکتسبن، وسئلوا الله من فضله، ان الله کان بکل شیء علیما'' (۴:۳۲) چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے اور جس طرح بد عمل مردوں کی برائیاں بتلائی ہیں اسی طرح بد عمل عورتوں کی بھی بتلائی ہیں۔ کہیں بھی دونوں میں کسی طرح کا امتیاز اس نے جائز نہیں رکھا ہے۔ مردوں کے لیے اگر فرمایا: '' التائبون العٰبدون الحٰمدون السائحون الرّٰکعون السّٰجدون الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحٰفظون لحدود الله'' (۹:۱۱۲) تو عورتوں کے لیے بھی فرمایا: ''مسلمٰت مؤمنٰت قٰنتٰت تٰئبٰت عٰبدٰت سٰئحٰت (۶۶:۵) منافقوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں جنسوں کا کیا: المنٰفقون والمنٰفقات بعضھم من بعض یامرون بالمنکر و ینھون عن المعروف (۹:۶۷) مومنوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں کا کیا: ''والمؤ منون والمؤمنٰت بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر'' (۹:۷۱) مردوں اور عورتوں کی یہ اخلاقی مساوات اس کا عام اسلوب ہے۔ ہر جگہ تم دیکھو گے کہ وہ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا، ایک ہی درجے میں رکھتا اور ایک ہی طرح پر ذکر و خطاب کرتا ہے:

''ان المسلمین و المسلمٰت ،و المؤمنین والمؤمنٰت والقٰنتین و القٰنتٰت و الصّٰدقین والصّٰدقٰت،و الصّٰبرین والصّٰبرٰت والخٰشعین و الخٰشعٰت والمتصدقین والمتصدقٰت والصائمین والصّٰئمٰت والحٰفظین فروجھم و الحٰفظٰت والذّٰکرین الله کثیراً والذّٰکرٰت اعدالله لھم مغفرة واجراً عظیما'' (۳۳:۳۵) یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی مسلمہ و مومنہ ہیں، جس طرح مردوں میں قانت مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانتہ عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بکثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف

رکھنے والیاں اور بکثرت ذکر کرنے والیاں ہیں اور پھر جس طرح مردوں میں ایسے پاک باز ہیں کہ نفسانی خواہشوں کے غلبے سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی ایسی پاک باز ہستیاں ہیں جو اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ غور کرو! کسی وصف میں بھی تفریق نہیں، کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں بھی عدم مساوات نہیں، پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بداخلاق ہے اور مرد بڑے پاک باز ہوتے ہیں، مگر بدبخت عورتیں نفس پرست اور مکار ہیں؟ تفسیر قرآن کی تاریخ کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک مصری بت پرست کے قول کو اللہ کا فرمان سمجھ لیا گیا اور اس سے اس طرح استدلال کیا جا رہا ہے گویا عورتوں کی جنسی پستی و بداخلاقی کے لیے کتاب اللہ کا قطعی فیصلہ موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر پاک بازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصے میں آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لیے ثابت ہو گی۔ یہ مرد ہی ہے جس کی حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گزرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے اسے بھی اپنی ہی طرح کا حیوان بنا دے، اس لیے اپنے "کید عظیم" کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس کے پیچھے قدم اٹھا دیتی ہے تو اس سے گردن موڑ لیتا ہے اور کہنے لگتا ہے "اس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اس کی برائی تو سب سے بڑی برائی ہے" فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے جو پہلے اسے اپنی کام جوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے۔

دنیا میں کوئی عورت بری نہ ہوتی اگر مرد اسے برا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ عورت کی برائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو، لیکن اگر جستجو کرو گے تو تمہیں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا اور اگر اس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۸۰-۲۷۵)

عدل ـــــ تعمیر و تحسین کی حقیقت:

تم نے ابھی ربوبیت اور رحمت کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے، اگر ایک قدم آگے بڑھو تو اسی طرح عدالت کا مقام بھی نمودار ہو جائے، تم دیکھو گے کہ اس کارخانۂ ہستی میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ ایجاب و تعمیر کو تم اسکی بے شمار شکلوں میں دیکھتے ہو اور اس لیے بے شمار ناموں سے پکارتے ہو، لیکن اگر حقیقت کا سراغ لگاؤ تو دیکھ لو کہ ایجابی حقیقت یہاں صرف ایک ہی ہے اور وہ عدل واعتدال ہے۔"

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۲۴۔ ۲۲۳)

قانون الٰہی:

دنیا میں کوئی شے نہیں جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن بھی نہ دیکھے ہوں اور باغ میں کون سا درخت ہے جس نے خزاں کے جھونکوں کے ساتھ کبھی نسیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں؟ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ایک ذرہ بھی قانون فطریہ و سلسلۂ علل و اسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب حالت بھی ایک قانون الٰہی اور ناموس فطری کے ماتحت ہے، جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کیے ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

ولن تجد لسنة الله تبديلا اور تم اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں کبھی تبدیلی نہ دیکھو گے۔

(مقالاتِ آزاد، ص ۶۴)

طلب مفرط:

طلبِ مفر جس چیز کی بھی ہے، انداد و طواغیت میں داخل ہے۔

[ابوالکلام آزاد (آثار و افکار) ص....]

خدا کا قانون:

قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لیے بھی ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لیے بدل دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے کوئی دھوکے میں پڑے ہو، تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں!

(ذکر آزاد، صفحہ ۱۵۴)

قانون ''قضاء بالحق'':

وہ کہتا ہے، جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی رہتی ہے، جو چیز نافع ہوتی ہے، باقی رکھتی ہے، جو نافع نہیں ہوتی اسے محو کر دیتی ہے، ٹھیک ایسا ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ جو عمل حق ہوگا قائم اور ثابت رہے گا، جو باطل ہوگا مٹ جائے گا۔ اور جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے تو بقاء حق کے لیے ہوگی نہ کہ باطل کے لیے۔ وہ اسے ''قضاء بالحق'' سے تعبیر کرتا ہے، یعنی فطرت کا فیصلہ حق جو باطل کے لیے نہیں ہو سکتا۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۵۳۔۱۵۲)

تعزیر اور اس کا منشا:

بلا شبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لیے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہ کوئی مستحسن عمل ہے، بلکہ اس لیے کہ معیشت انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک کم درجے کی برائی تھی جو اس لیے گوارا کر لی گئی، کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنالیا اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوف ناک آلہ بن گئی۔

(ترجمان القرآن، ا۔ صفحہ ۱۹۵)

قانون فطرت اور اقوام و جماعات:

اسی طرح وہ قانون ''قضا بالحق'' کو جماعتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بھی منطبق کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: جس طرح فطرت کا قانون انتخاب افراد و اجسام میں جاری ہے اسی طرح اقوام و جماعات میں بھی جاری ہے۔ جس طرح فطرت نافع اشیاء کو باقی رکھتی، غیر نافع کو چھانٹ دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جماعتوں میں بھی صرف اسی جماعت کے لیے بقا ہوتی ہے جس میں دنیا کے لیے نفع ہو۔ جو جماعت، غیر نافع ہو جاتی ہے چھانٹ دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ اس کی ''رحمت'' ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں انسانی ظلم و طغیان کے لیے کوئی روک تھام نظر نہ آتی۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۱۶۸)

جماعت اہل حق:

سخت سے سخت عہد شر و فساد اور ظلمت و ضلالت میں بھی ایک جماعت اہل حق و ظاہرین علی الحق کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ (تذکرہ، ص:۱۲)

مسلمان کا وجود:

ایک مسلمان کا وجود یک سر دعوت وعظ ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان ہو!

(جامع الشواہد..، صفحہ ۴۷)

عشاق حق:

صدیاں گزر گئیں عشاق حق کے ذکر میں آج یہ تاثیر ہے، نہیں معلوم ان کی پاک صورتوں اور پاک صحبتوں کی گیرائیوں اور دل ربائیوں کا کیا حال ہوگا:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما
(حافظ)

(تذکرہ، صفحہ ۶۲)

علمائے حق اور فتنۂ عوام و حکومت:

اصل یہ ہے کہ علمائے دنیا کو فقرائے حق کی اذیت و مخالفت کے لیے ہر عہد میں کسی نہ کسی آلۂ تضلیل وحیلۂ قتل کی تلاش رہتی ہے اور وہ ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر نکال ہی لیتے ہیں۔ پھر جہاں کسی کو راہ حق و اصلاح میں سرگرم اور اپنی نفس پرستیوں کی راہ میں مخل دیکھا جھٹ وہی الزام اُس کے سر تھوپ دیا اور عوام و حکومت، دونوں کا فتنہ اس کے پیچھے لگا دیا۔ ہر زمانے کے حالات اور عوام کے میلان و اعتقاد کے مطابق یہ آلہ بھی ڈھلتا رہا ہے اور گو ہتیار بدلتے رہے، لیکن کاٹ سب کی یکساں رہی ہے۔

(تذکرہ، صفحہ ۹۸۔۲۹۷)

حق کے پرستار:

انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیاز این و آں نہیں ہے وہ جو وطن کی قید سے منزہ، زمین و مرزبوم کی تمیز سے پاک ہیں، ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا

مقدس، اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے، وہ انسانیت کے خادم ہیں۔ ان کی محبت کا نوئی شرف، وطن و قوم کی ادنیٰ ترین تقسیموں سے آلودہ نہیں ہوتا۔ ان کے کانوں میں جہاں کہیں سے بھی انسانیت کی فریاد الغیاث آتی ہے، آنکھوں کے آنسو اور دل کے زخموں کو اپنے استقبال کے لیے مہیا پاتی ہے۔ مشرق و مغرب ان کے لیے یکساں ہے۔ عزیز و بیگانہ کی تفریق میں ان کے لیے آزمائش نہیں۔ طرابلس و مقدونیا کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر اگر وہ ماتم کرتے ہیں، تو جنوبی افریقہ کے اُن قتیلانِ حق وانصاف کے خوں چکاں زخموں کو بھی دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں جنہیں کوڑوں کی وحشیانہ عقوبت نے خاک و خون پر لٹادیا ہے۔ ولیس البران یحب الوطن، انما لبران یحب العالم!

عارف ہم از اسلام خراب ست وہم از کفر
پروانہ چراغِ حرم و دیر نہ داند!

[مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ چہارم) صفحہ ۵۶]

داعی اور تاجر کا تضاد:

عشق، بلحاظ عشق اور خواص و نتائج عشق کے ایک ہی ہے، اور اس میں کسی نوعی امتیاز کا متعین کرنا ممکن نہیں۔ ہر عاشق، عاشق ہوتا ہے، اسلیے ہر عاشق خود رفتہ ہوگا، دل بکف ہوگا، جاں دادۂ راہِ اُلفت ہوگا، اور حیران جادۂ ہجراں و وصال۔

اس لحاظ سے قیس عامری کی نجد پرستی، فرہاد کی کوہ کنی، اور نل کی شوریدگی، سب یکساں ہیں۔ وہ جو اپنے گم گشتہ عزیزوں کے لیے روتا ہے، وہ جو کسی بستر مرگ کا ماتم زدہ ہے، وہ جو کسی کی یاد رفتہ کی کھٹک رکھتا ہے اور پھر وہ جو کشتۂ تغافل ہے، اور وہ جو ہلاک تبسم ہے، سب ایک ہی طرح کے عشق پیشہ اور ایک ہی راہ کے جادہ پیما ہیں، اگرچہ مختلف ناموں سے مسمّی ہیں:

وللناس فیمایعشقون مذاہب!

پس ایسی حالت میں تمیز عشق کے لیے عشق کرنے والوں کو دیکھنا بے سود ہوگا۔ چاہیے کہ عاشق کے قسم عشق کی پہچان کے لیے سب سے پہلے اُس کے معشوق کو دیکھا جائے کہ وہ کون ہے؟ یہی رشتہ اصلی سر رشتۂ تقسیم ہے، اور اسی نسبت سے عشق کی مختلف راہیں متعین ہو جاتی ہیں:

دو چشم ساکن بیت الحزن بمن گوید
کہ من اسیر بہ معشوق او بفرزنداست

عشق کی ساری منزلیں اسی نسبت سے متحقق ہوتی ہیں۔عاشق کے وجود کی بنیاد معشوق کا انتخاب ہے۔اس کے تمام جذبات وامیال، مذہب ومشرب، اعمال وعقاید، اوضاع ورسوم، نظر وفکر، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے اپنے عوض دل وجان کے لیے کس کو انتخاب کیا ہے؟ اپنی نظر شیفتگی وشوریدگی کے لیے کس کی چشم وابرو پر نظر پڑی ہے؟ اپنی جبہ سائی شوق کی عقیدت ونیاز کا کس کی چوکھٹ کو مستحق سمجھا ہے؟ اور اپنی اطاعت وعبودیتِ محبت کے لیے کس قہرمان حسن وجمال کے حکم عشق اور فرمان نیاز کے آگے سر بسجود ہوا ہے؟

اسی راہ پر چل کر دعوت اور تجارت کے باہم تضاد وتبائن مسلک کا بھی پتہ لگاؤ، اور اندازہ کرو کہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے کس قدر ابعد ہیں، اگرچہ نفس عمل، صرف قوی انفاق حیات کے اعتبار سے دونوں میں پوری پوری یکسانیت بھی پائی جاتی ہے؟ تاجر اور داعی کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ ایک تاجر کی حیاتِ عشق کا معشوق کون ہونا چاہیے، اور ایک داعی کی حیاتِ محبت کی محبوبیت کس میں ہوتی ہے؟ تاجر کو تم دیکھو گے کہ وہ تاجر نہیں ہے اگر نفع خاص اور حصولِ زر اس کا معشوق ومطلوب نہ ہو برخلاف اس کے داعی وہی ہوگا جس کا محبوب نفع عام اور اس لیے حصول زر نہیں، بلکہ طلب بے زری ہو۔ تاجر اگر پانے کو اپنا معشوق نہ بنائے تو اپنی ہستی کھودے، اور داعی اگر کھونے کے عشق سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہو تو اس پر لذت دعوت حرام ہے:

کسے کو تشنہ وصل است باکوثر نمی سازد
بہ آبِ خضر اگر عاشق رسد لب تر نمی سازد

الفت خطرناک است پہنائش نظر در کن!
دراں وادی کہ عشق اوست تن باسر نمی سازد!

(مقام دعوت، ص۲۱-۱۹)

پیروان اسلام کا مقام:

ہم اسلام کو اس سے بہت بلند سمجھتے ہیں کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے شعبے میں بھی کسی دوسری قوم کی تقلید پر مجبور ہوں وہ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے والے ہیں، نہ کہ خود

دوسروں کے مقتدی بننے والے۔

[الہلال (کلکتہ) ج ۱، ش ۸، ص ۹]

صاحب ارشاد کی صحبت:

توفیقِ الٰہی کی سیکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت وتربیتِ غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان وپُر امن راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحبِ ارشاد کی ہمت وصحبت حاصل ہو جائے۔

(تذکرہ، صفحہ ۳۳۰)

حق کے حق گذار اور ان کی ہیبت:

جن پاک روحوں نے خدا کی سچائی اور کلمۂ حق وعدل کی خدمت گذاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا، وہ کسی سے نہیں ڈرسکتے۔ البتہ ان کی ہیبت وقہاریت سے دنیا کو ڈرنا چاہیے۔

(رسول رحمت، ص ۶۱)

ارباب صدق وصفا:

مذہب کے دکانداروں نے جہل وتقلید اور تعصب وہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی وتحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد وبے قیدی کو حکمت واجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محرابِ مسجد میں اخلاص، اور نہ مے کدے میں رندانِ بے ریا۔ ارباب صدق وصفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے:

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگ رہِ مابود
رفتیم و صنم برسر محراب شکستیم

(تذکرہ، صفحہ ۴۰)

صاحبِ امر وحکم:

اسلام میں حق امر وحکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام وحکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ "ان الحکم الا للہ" تو اس کے احکام دینیہ کیوں کر تابع آوازِ اشخاص وجماعات مخصوصہ ہو سکتے ہیں؟ اس نے یہ حق صرف قرآن کو دیا

ہے، یا پھر دنیوی امور میں اُس اجماع کو، جو تمام مسلمانوں کی اکثریہ رائے سے عبارت ہے۔
(مساجد اسلامیہ اور خطباتِ سیاسیہ، ص ٦)

سوسائٹی کی ضرورت:

ایک حق گو اور راست باز انسان ہیئت اجتماعی اور مجتمع انسانی (یعنی سوسائٹی) کا محافظ ونگراں کار ہے۔ اگر ملک و حکومت کو حفظ امن اور تہدید اشرار کے لیے پولیس کی ضرورت ہے تو یقیناً مجتمع انسانی اور ہیئت اجتماعی کے بدکار اور شریر ہستیوں کی تہدید و تخویف کے لیے حق گو اور راست باز انسانوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔
(الہلال، کلکتہ، ٦/ مئی ۱۹۱۴ء ص ۳۵۵)

غیر معصوم کے قول کا قابل حجت ہونا:

کسی غیر معصوم کا قابلِ احترام واتباع ہونا اس کے لیے مستلزم نہیں کہ اُس کا ہر قول و حال حجت ہو، اور نہ کسی غیر معصوم کے کسی ایک قول واجتہاد کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اُس کے تمام محاسنِ اقوال واعمال کو ترک کر دیا جائے۔ قرآن حکیم نے سچے مومنوں کی جو شان بتلائی ہے وہ اُن کی اس طلب ودعا سے ظاہر ہے: لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا پس جب عام مومنوں کی نسبت یہ حکم ہے، تو اصحاب علم و فضیلت کی طرف سے دل میں غِل و بغض کا ہونا کب جائز ہو سکتا ہے!
(تذکرہ، ص ۵۷)

طرق تطبیق عقل و نقل اور حکمائے سوٗ و حکمائے حق:

اور یاد رہے کہ یہی فرق حکمائے سوء اور حکمائے حق کے طریقِ تطبیقِ عقل و نقل میں بھی ہے۔ پہلا گروہ انسانی نظریات وظنون کو باہم علم مرکز حق و یقین قرار دے کر وحی الٰہی سے اُس کے چاروں طرف طواف کرانا چاہتا ہے، اور دوسرا گروہ مرکزِ حق و یقین وحی الٰہی اور حکمت نبوی کو قرار دیتا ہے اور تمام انسانی معلومات وافکار کو اس کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اور راہِ مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ تطبیق دونوں دیتے ہیں اور رفاقت علم و عقل کے دونوں مدعی، مگر دونوں کے طریق سیر ووصول میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

نزلوا بمكة فی قبائل هاشم
ونزلتُ فی البيداء اَبعد منزل

(تذکرہ، ص ۶۰)

اقوام کی زندگی اور اشخاص:

ایک ہی انسان چاہے جو انسان ہو اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کردے۔ اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے ہے مگر اقوام کی زندگی اشخاص ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں، لیکن ان کی موت وحیات کے یہی معنی ہیں کہ پہلی صورت میں اُن نفوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں۔ جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے سر چشمے سے پوری قوم کے کشتِ اقبال کو سر سبز وشاداب کردیتے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں:

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر سے
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

(مضامین ابوالکلام آزاد، بدرالحسن، صفحہ ۳۶۲)

علمائے دنیا پرست:

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے، لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے، لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر اُن کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اُس کی کثافت کو خمیر دیتی، اور دنیا طلبی کی آگ اُس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جام صحت پیتے ہیں، اور چور اور

ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں، مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیر تا پھاڑ تا اور پنجہ مار تا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار اور الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں، مگر عین محراب مسجد کے نیچے پیشوائی و امامت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنادیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔

(تذکرہ، صفحہ ۵۔۱۰۴)

اصحاب احوال و طریق:

اصل یہ ہے کہ احوال و طریق کے معاملات کچھ عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں، اور یہ قوم اپنے کلمات و اقوالِ غریبہ کے لیے بہت سے عذرات پیش کرتی ہے۔ اہل حق و انصاف نے ان عذرات کو قبول کیا ہے، مگر جو لوگ ذوق حقیقت سے محروم اور سجن الفاظ و صورت میں محبوس ہیں، اُن کا فہم نارسا وہاں تک نہیں پہنچتا، اور رایت اسد اُریمی سن کر شیر کے پنجے اور ناخن ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ خواطر و احوال کے لیے شریعت الٰہی اور علوم انبیاے کرام محکِ ردو قبول و معیار ظن و یقین ہیں، لیکن اکثروں کو مغلوبیت سکر و سرگشتی حال میں اس کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ اس کسوٹی کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ یہ سخت غلطی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ ہماری درماندگی و معذوری پر بھی نظر رہے۔ (تذکرہ، صفحہ ۵۳)

علمائے عہد اور ان کے حیل و مکائد:

یہی حال آج علمائے عہد کا بھی ہو رہا ہے۔ اور امر بالمعروف اور قیام حق کے حکم سے اپنے آپ کو بری کرنے کے لیے بہ القائے شیطانی طرح طرح کے حیل و مکائد بنا رکھے ہیں، اور جب وقت آتا ہے تو انہی کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملاً امر بالمعروف کا حکم ساقط و کالعدم ہو گیا۔ کبھی کہتے ہیں کہ درجہ عزیمت و عزائم امور بہت بلند ہے، ہمیں کہاں نصیب! رخصت یہ ہے کہ بخوف نقصان جان و مال باطل پرستی قبول کرلی جائے۔ علیٰ خوفِ

من فرعون و ملائهم ان یفتنهم! کبھی کہتے ہیں کہ صداقت موسوی سے انکار نہیں، لیکن ہیبت و سطوتِ فرعونی کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے، پس خاموشی و ترکِ سعی کے سوا چارہ نہیں!فاذهب انت وَ رَبكَ فقا تلا انا ها هنا قاعدون کبھی کہتے ہیں کہ اگرچہ حق اس کے خلاف ہے مگر مصلحت وقت کا مقتضیٰ یہی ہے۔ گویا مصلحت حقائق اشیاء کو متغیر کر دے سکتی ہے! کبھی کہتے ہیں کہ زبان کھولنے میں فتنہ ہے اور فقہا کا ایک جزیہ ہم کو مل گیا ہے کہ فتنہ سے بچنا ضروری۔ گویا حق گوئی میں فتنہ ہے اور سکوت عن الحق میں امن و سلامتی: وَلو اتبع الحق اهواء هم لفسدتِ السما و ات و الارض۔ کبھی کہتے ہیں کہ علیکم انفسکم اور لا تلقوا با یدِ یکم الی التهلکة پر ہمارا عمل ہے: یحرِ فون الکلمَ عن موا ضعه ۔ کبھی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں باتیں یقیناً بدعات و منکرات میں داخل ہیں لیکن عوام صدیوں سے کر رہے ہیں۔ اگر صاف صاف حق گوئی سے کام لیں گے، تو بگڑ جائیں گے اور ہم کو بزرگ اور پیشوا نہیں سمجھیں گے اگر ایسا ہوا تو موجودہ حالت سے بھی زیادہ نقصان ہوگا: ان کثیر امن الا حبار والرهبان لیا کلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله ۔ کبھی کہتے ہیں کہ اس میں خوفِ جان ہے، اور جان کا بچانا فرض ہے۔ غرض کہ یعدُهم وَیمنیهم وَمایعِدُهم الشَیطان الا غرورا۔ یہ سب کچھ کہتے ہیں، مگر اصلی بات نہیں کہتے کہ ایمان باللہ مفقود ہو گیا، حیات دنیوی کی محبت، محبت الٰہی پر غالب آگئی: متاعِ دنیا کی دل فریبیوں پر روح مفتون اور دل نثار ہو گیا، اور دنیا پرستی کی لعنت نے عزم و راستی کی روح کو مردہ کر دیا، استحوذ علیهم الشیطانُ فانساهم ذِکراللهِ اولئِك حزب الشیطانِ الا انّ حِزب الشیطانِ هم الخاسرون !

(تذکرہ، صفحہ ۸۰۔۷۹)

مدعیانِ علم و مشیخت اور فریضۂ امر بالمعروف:

یہ افسانہ تو اُس عہد کا ہے، جس کو موجودہ عہد کے مقابلے میں عہد اقبال سمجھنا چاہیے۔ آج جو حالت ہو رہی ہے، اس کو دیکھیے تو ہوش گم اور عقل درماندہ رہ جاتی ہے۔ آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کبھی سچائی کی خاطر کچھ نقصان جان و مال اٹھالے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے، لیکن مدعیان علم و مشیخت اور زہد فروشانِ سجادۂ طریقت سے

اتنی بھی امید نہیں۔ علمائے وقت نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو عملاً شریعت کے احکام وواجبات سے خارج کر دیا ہے، اور یا تو اب یہ لفظ قرآن کی سورتوں میں کبھی نظر آجاتا ہے، یا صحائف سنت کے ابواب واوراق میں۔ حق کی بے کسی و مظلومی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جنگل میں بھیڑوں اور بکریوں کے لیے چرواہا نظر آجاتا ہے، لیکن حق کے لیے کوئی غمگسار و مددگار نہیں۔[1]

(تذکرہ، صفحہ ۷۹۔۷۸)

علمائے دنیا پرست اور مدعیان تحقیق جدید:

تاریخ مذہب کے ہر گذشتہ دور کی طرح اس دور میں بھی افراط کی دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ پہلی جماعت علمائے دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی، جو اپنی ہوا پرستیوں اور تعصب و جہالت سے اصل مذہب کو بدنام کر رہے تھے، دوسری جماعت اُن کے مدِ مقابل مدعیان تحقیق جدید و اجتہادِ فکر کی تھی، جنھوں نے حکمت و دانشمندی اور مذہبِ عقلی و طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بیقیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی۔ اور اہل حق و اقتصاد کا طریق ان دونوں سے الگ تھا۔ وہ جس طرح پہلی جماعت کے تسبیح زور اور خرقہ سالوس سے بیزار تھے۔ اسی طرح دوسری جماعت کے فریب عقل اور فتنۂ دانش و آزادی سے:

ازآں دعویٰ بشیخ و برہمن ماند
کہ ہریک داورے رامی پرستند

(تذکرہ، صفحہ ۴۰)

علمائے سوء:

افسوس! ہر عہد اور ہر دور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں، علمائے سوء ہی کے ہاتھوں ہوئیں۔ وقت اور زمانے کی شکایت بے سود ہے:

تاکے ملامتِ مژہ اشک بار من
یک بارہم نصیحتِ چشم سیاہ خویش

(تذکرہ، ص ۴۲)

المرشدون الجاھلون:

ہماری بدبختی نے خود ہماری بربادیوں کے سامان کر دیے ہیں۔ قوم کے قدرتی پیشوا

علمائے مذہب تھے۔ اگر قرآن مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کا جامع ہے تو جس جماعت کے پاس قرآن کا علم ہو گا، وہی ملت مرحومہ کی دینی و دنیوی پیشوائی کی اہل ہو گی۔ لیکن ہمارا مرض پاؤں میں نہیں بلکہ دماغ میں ہے۔ ہمارے پاؤں میں لنگ نہیں ہے مگر دماغ میں قوت ارادہ باقی نہ رہی۔ علماء نے اپنے فرائض کو سب سے پہلے خیر باد کہا، اور پھر انہی کی ضلالت سے قوم کی تمام گمراہیوں کی تولید ہوئی۔

اب حالت یہ ہے کہ ایک گلہ ہے جس کا کوئی چرواہا نہیں۔ نئے لوگ مسند پیشوائی پر بیٹھے ہیں۔ ان کا جہل مرکب اور نفس خادع جو کچھ ان کے قلب پر القا کرتا ہے، اُسی کو اسلام کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہر شخص جو قلم پکڑ سکتا ہے شیخ الاسلام ہے، ہر اخبار کا ایڈیٹر جو چند آدمیوں کا وقت خرید سکتا ہے مفسر قرآن ہے۔ ہر انگریزی داں، ہر خطاب یافتہ، ہر سیکریٹری، ہر متولی، حق رکھتا ہے کہ اپنے ہر القاء شیطانی کو تعلیم اسلامی قرار دے، اور اپنے ہر ہیجان نفسانی کو اجتہاد دینی سے تعبیر کرے: الا انهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون (۲۔ ۱۲)۔

پھر یہ کون ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں اور اپنے احکام و اوامر ہم پر نافذ کرتے ہیں؟ ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے علوم دینیہ کی تحصیل کی ہے، اور کتنے ہیں جن کو قرآن و سنت کی خبر ہے؟ جہل مطلق کے سوا کیا ہے جسے وہ پیش کر سکتے ہیں، اور تعبد حکام کی بخشی ہوئی ذلت عزت نما کے سوا کونسی شے ہے جس پر انھیں ناز ہے؟ بیشک، اچھا کپڑا اور شاندار مکان ایک انسان کو سوسائٹی میں ممتاز کر سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کے پاس کوئی گراں معاوضہ نوکری ہے، کوئی قیمتی جائداد ہے، یا کوئی سرکاری خطاب ہے، تو کچھ ہرج نہیں اگر وہ ان چیزوں سے اپنے دل و دماغ کو خوش کرے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اُسے دنیا سے ناجائز مطالبات کرنے کا حق بھی حاصل ہو گیا ہے، اور جہل و علم کے جو قدرتی حدود ہمیشہ سے یکساں طور پر موجود ہیں وہ اس کی خاطر توڑ دیے جائیں؟

(مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ، ص ۴، ۵)

القرآن الحکیم:

قرآن حکیم ایک مجموعہ صداقت ہے، اس لیے اُس نے دنیا کی تمام صداقتوں کے ساتھ سیاست کو بھی اپنے دامن میں سب سے پہلے جگہ دی اور جو نور چند لمحوں کے لیے کوہ

طور پر چمکا تھا، وہ ہمیشہ اُس کے تاج حقیقت کا طرۂ زرنگار رہا، سیاست الٰہی فرعون کے تاج و تخت کی ذمہ دار نہیں تھی اس کا کام ابو جہل وابو سفیان کی سیادت کو محفوظ رکھنا نہ تھا، وہ دنیا میں صرف میزان عدل کے قائم کرنے کے لیے آئی تھی، اس لیے اس نے ایک فطری مذہب کی آغوش میں اپنے آپ کو نمایاں کیا، کیونکہ فطرت ہی ایک ایسی چیز ہے جو خود عدل و انصاف سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتی، اور اگر وہ اپنے مرکز سے ہٹ جائے تو دنیا کا تمام قدرتی نظام دفعتاً درہم برہم ہو جائے۔

(الدین والسیاست، ص ۳)

قرآن کی کاملیت و کفایت:

اگر آپ طالب حقیقت ہیں تو ان جھگڑوں میں نہ پڑیئے، نہ ان خرافات کے بارے میں سوالات کیجیے۔ ہمیں تلاش نجات کی ہے۔ اگر نجات کے لیے قرآن کامل ہے تو پھر وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے بتلا دیے ہیں۔ زیادہ کاوش میں پڑیں ہی کیوں؟

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۸۶)

شرک فی صفات القرآن:

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی الصفات کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے۔

(الہلال، کلکتہ، ج ۱، ش ۹، ص ۷)

نزول قرآن اور اس کے احوال و ظروف:

قرآن حکیم کے بطون وارواح کی طرح وہ ظروف و مواقع بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے، جن میں اس کی مقدس سورتوں اور آیتوں کا نزول ہوا ہے، دیوار کے لیے اینٹ اور گارا ایسے ضروری اجزا ہیں، مگر ان سے اس سفیدی کی دل آویزی میں کچھ فرق نہیں آسکتا جو اگرچہ دیوار کی سطح پر ہے۔ لیکن مکان کے اور اجزاء سے گزرنے والوں کو کہیں زیادہ اپنی طرف مائل کر رہی ہے۔

(رسول رحمت، ص ۶۲۴)

زندگی اور سعادت کے لیے اصل کام:

عزیز من! محض باتوں سے تو کچھ نہیں بنتا، اصل چیز عمل ہے۔ آج مسلمانوں کی زندگی وسعادت کے لیے کوئی کام اس درجہ اہم اور ضروری نہیں، جس قدر یہ کام کہ قرآن کی تعلیم اپنی حقیقی شکل ونوعیت میں نمایاں ہو اور مسلمانوں میں اس کی عالم گیر اشاعت عمل میں آئے۔

(خط بنام مولانا غلام رسول مہر، نقش آزاد، ص ۳۴)

قرآن اور رائے وکلام:

جس وقت سے انسانی علوم اور علوم سماویہ کی آویزش کا حال معلوم ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کوئی شبہ واعتراض ایسا نہیں کیا گیا ہے، جس کا اصولی جواب قرآن میں نہ دے دیا گیا ہو اور اس کے لیے رائے وکلام کی ضرورت ہو!

(تذکرہ، ص ۲۴۴)

اصول تفسیر:

قرآن کریم کی تفسیر کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے قرآن کے مبہمات وغرائب اور محذوفات وضمائر کی تفسیر خود قرآن ہی سے پوچھی جائے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص امتیاز ہے کہ اس کا ایک ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے کے لیے مفسر ومشرح ہوتا ہے۔

(مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ، ص ۲۰)

متقدمین کا اصول تفسیر:

اس نکتے پر نظر رہنی چاہیے کہ تفسیر قرآن کے معاملے میں جس قدر اختلافات کی کثرت اور مذاہب وطرق کا تعدد اور تنوع نظر آتا ہے، وہ تمام تر متاخرین کی فلسفیانہ کاوش پسندی کا نتیجہ ہے۔ جب کہ معقولات کے شیوع اور یونانیہ کے غلبہ واحاطہ سے علوم دینیہ میں اس "تعمق" کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں، جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "هلك المتعمقون"۔ فکر ونظر میں عجمیہ کے ظہور، عربیۃ خالصہ وصالحہ کے بعد اور علوم سنۃ کے ترک وہجر نے اس معاملے کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اوائل وسلف میں یہ تمام اختلافات یک قلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور ہر لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے جو عربی لغت ومحاورہ میں ہو سکتے

ہیں اور لوگ اس پر قانع تھے۔ ابداع معنی کثیرہ اور تفحص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کاوش ہی نہیں کی جاتی تھی۔ نہ فرضی و تخمینی شکوک وایرادات گڑھ کر نئے نئے معنی فرض کیے جاتے تھے۔

اولوالامر کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائے گا جس کی عربیت خالص و صحیح ہو تو طرف ایک ہی معنی اس کے ذہن میں آئیں گے! یعنی صاحب حکومت۔ کسی دوسرے مفہوم کا اسے وہم بھی نہیں گزرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے، لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ امکانی مطالب کا وسیع سے وسیع میدان ڈھونڈھتے ہیں، اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کے لیے اختیار کر لینا چاہتے ہیں، پس متاخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو، اور لغت و عربیت اس کی تصدیق کرے۔ متاخرین کی کاوشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تفنن ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن تفسیر قرآن نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو خود حامل قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو، اور اُن لوگوں نے بتلائی ہو جنکے علم و عمل پر خود اللہ نے اپنی رضاء و پسندیدگی کی شہادت دی ہے: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ! اگر سلف سے اعراض وانکار اس بنا پر ہے کہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے ناآشنا تھے، تو کم از کم قرآن کا علم تو ان کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل تو ہوا ہو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، لیکن اس کے معانی و مطالب اُس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہوں جب تک ارسطوے یونانی ان کی رہنمائی نہ کرے!

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، ص ۲۷-۲۶)

سوء فہم اور تاویل باطل:

دنیا کی تاریخ ہدایت واصلاح امم کی نصف گتھیاں اسی سوء فہم اور تاویل و تعبیر باطل کی الجھائی ہوئی ہیں۔ پہلوں نے کچھ کہا تھا اور پچھلوں نے کچھ سمجھا۔ معتقدین نے غلو کیا اور مخالفین نے تعصب و تشدد! ظلمات بعضھا فوق بعض۔ اور تاریکی میں اصل حقیقت گم ہو گئی۔ اصحاب طریق و معارف کی باتوں کے سمجھنے کے لیے بھی دل صافی اور فہم مستعد وعالی چاہیے۔ صرف مدرسوں کی دماغ سوختگی اور تسبیح وسجادہ کی دکان آرائی سے یہاں کام نہیں چلتا:

چو بشنوی سخنِ اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ای دلبرا! خطا اینجا ست

تاریخ عالم کی پرانی سے پرانی گمراہی کا بھی سرچشمہ اگر ڈھونڈھا جائے، تو یہی سوءِ فہم کا فتنہ نکلے گا۔ بتلانے والوں نے کیا کہا تھا اور سمجھنے والوں نے کیا سمجھا! ہمارا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام بانیان ادیان و ملل میں سے کسی نے بھی شرک وانسان پرستی کی تعلیم نہیں دی تھی۔ پرانی سے پرانی بات جو دنیا میں کہی گئی ہے۔ صرف سچائی اور خدا پرستی ہے لیکن معلوم ہے کہ ان کے ماننے والوں نے شرک و بت پرستی کا راستہ اختیار کیا اور اپنی ساری کج فہمیوں کو انہی کی جانب منسوب کر دیا جب انبیائے کرام علیہم السلام کے ارشاداتِ محکمہ کو اُن کے پیرو نہ سمجھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صاف صاف تمثیلوں کو کیا سے کیا بنا دیا، تو پھر عامہ مصلحین امت و صلحائے طریق کہ بیچارہ کار و درماندہ احوال و دل باختہ کشاکشِ تلوین و تمکین ہیں، اس فتنہ سے کیوں کر بچ سکتے ہیں:

آں کس است اہل بشارت کہ اشارت داند
نکتہا ہست بسے، محرمِ اسرار کجا ست!

(تذکرہ، صفحہ ۵۰۔۴۹)

قرآن کے اسرار و معارف اور دل کی محرومی:

جو دل زادِ تقویٰ سے محروم، اور ہوائے نفسانی و آلائش دنیا پرستی میں گرفتار ہے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کے حقائق و معارف کا تجلی گاہ نہیں بن سکتا علم و فضل اس کے لیے بالکل بیکار ہے، اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا "ذالك فضل الله يوتيه من يشاء":

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب
اینہا ہمہ آرائش افسانۂ عشق است

قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں، گو وہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کر لے۔ [مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ دوم) صفحہ ۱۷]

امثال القرآن: (مولینا سید سلیمان ندوی کے نام)

"امثال القرآن کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے بالکل درست ہے۔ یعنی حالاتِ

وقتِ نزول و طریق تمثیل و بیانِ عربِ جاہلیہ۔ یہ دو چیزیں نہ صرف امثال القرآن بلکہ تمام قرآن کے فہم و درس کے لیے بمنزلہ اساس و اصل کے ہیں اور امثال و اقسام و انواع بیان و تخاطب و تذکیر کے لیے تو اولین نظر انھیں پر ہونی چاہیے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۳۷)

کامیابی کا حق:

اگر تم ایمان، عمل، تواصی بالحق اور صبر و قربانی کے لیے تیار نہیں ہو تو تم کو حق نہیں کہ خدا کی زمین پر کامیابی کو ڈھونڈھو۔

(ذکر آزاد، صفحہ ۱۵۵)

شرائط کامیابی:

اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، عمل صالح، توصیہ حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔

(خطبہ صدارت، صوبائی مجلس خلافت آگرہ)

ہدایت کے مراتب اربعہ: وجدان۔ حواس۔ عقل۔ وحی:

ہدایت کے بھی مختلف مراتب ہیں جو ہم حیوانات میں محسوس کرتے ہیں:

سب سے پہلا مرتبہ وجدان کی ہدایت کا ہے، وجدان طبیعت حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لیے رونے لگتا ہے اور پھر بغیر اس کے کہ خارج کی کوئی رہنمائی اسے ملی ہو، ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے اور وہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے اور انھیں کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔

ہدایت فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کے لیے ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیسرا مرتبہ ہدایت بھی موجود ہے اور وہ عقل کی ہدایت ہے، فطرت کی یہی ہدایت ہے جس نے انسان کے آگے غیر محدود ترقیات کا

دروازہ کھول دیا ہے اور اسے کائنات ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل و خلاصہ بنادیا ہے۔

وجدان کی ہدایت اس میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے، حواس کے لیے معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور عقل نتائج و احکام مرتب کرتی ہے۔ حیوانات کو اس آخری مرتبے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے ان کا قدم وجدان اور حواس سے آگے نہیں بڑھا، لیکن انسان میں یہ تینوں مرتبے جمع ہو گئے۔

جوہر عقل کیا ہے؟ دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے، اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے، روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا، انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجہ کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبے سے ایک دوسرا بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے، لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام مرتبہ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی رہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دست گیری نمایاں ہوتی ہے۔

لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کر دے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے، ہمیں استنباط و استنتاج کی ضرورت ہے، احکام کی ضرورت ہے، کلیات کی ضرورت ہے اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔ وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں ترتیب دیتی ہے اور ان سے احکام و کلیات کا استنباط کرتی ہے۔

علاوہ بریں جس طرح وجدان کی نگرانی کے لیے حواس و مشاعر کی ضرورت تھی، اسی طرح حواس کی تصحیح و نگرانی کے لیے عقل کی ضرورت ہوئی، حواس کا ذریعہ ادراک نہ صرف محدود ہی ہے، بلکہ بسااوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔

اگر مرتبہ حواس سے ایک بلند تر مرتبہ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی ان درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پاسکتے، لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے، وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

لیکن جس طرح وجدان کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، اور جس طرح حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی ہدایت کا کوئی مزید مرتبہ ہونا چاہیے، کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کے دائرہ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا ہے، عقل کی کارفرمائی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اسی حد تک کام دے سکتی ہے جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں، لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی؟ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے، اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔

علاوہ بریں جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے، عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے، نہ ہر حال میں موثر۔ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کش مکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کے لیے ہوتی ہے۔ بسااوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنادے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں۔ اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

اچھا! اگر خدا کی ربوبیت کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیں وجدان کے ساتھ حواس

بھی دے۔ اور اگر ضروری تھا کہ حواس کے ساتھ عقل بھی دے، تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے۔ کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اعمال کی درستگی وانضباط کے لیے کافی نہیں۔

اللہ کی ربوبیت نے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ یہی مرتبہ ہدایت ہے جسے وہ وحی ونبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس نے جابجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے اور انہیں ربوبیت الٰہی کی سب سے بڑی بخشش ومرحمت قرار دیا ہے۔

وحی الٰہی کی ہدایت عالم گیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق وامتیاز تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ جس طرح خدا نے، وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل وقوم کا امتیاز رکھا، نہ زمان ومکان کا۔ اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقے وامتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کے لیے ہے اور سب کو دی گئی ہے۔

اس عالم گیر ہدایت وحی کو وہ "الدین" کے نام سے پکارتا ہے۔ یعنی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین اور اسی کا نام اس کی زبان میں "الاسلام" ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۴۵-۳۳۹)

راہِ حق واعتدال: کتاب وسنت اور علمائے حق سے محبت وارادت:

صحیح راہ حق واعتدال کی یہ ہے کہ دو اصل ہیں، اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب وسنت ونصوص شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیے اور اسی پر حکم وعمل کرنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ تمام ائمہ اسلام اور علمائے حق سے حسن ظن اور محبت وارادت رکھنی چاہیے اور ان کے مراتب وحقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن وتناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ انہی میں افراط وتفریط کی ہے، یا دونوں میں سے صرف کسی ایک ہی کے ہو رہے ہیں۔ ایک جماعت احکام ونصوصِ شرعیہ کے اتباع وتقدیم کا یہ مطلب سمجھتی ہے کہ جہاں کسی اہل علم وحال کا کوئی قول بظاہر کسی حکم ونص کے خلاف نظر آیا، بلا تامل تضلیل وتکفیر پر آمادہ ہو گئے اور جھٹ حکم لگا دیا کہ وہ منکر شریعت ہے، اگرچہ اس نے اپنی ساری

زندگی شریعت کے علم و عمل میں بسر کردی ہو، دوسری جماعت نے ائمہ واکابردین کی پیروی اور محبت و اعتقاد کے یہ معنی سمجھے کہ احکام و نصوص کو ان کا تابع و محکوم بنادیا، اور چند غیر معصوم انسانوں کی خاطر کتاب و سنت کو ترک کر کے اتخذوا احبارھم ورُھبانھم ارباباً من دون اللہ کی سرحد سے قریب ہوگئے۔ اس دوسری جماعت کا عجیب حال ہے۔ یہ جب کبھی اپنے پیشواؤں کے کسی قول کو احکام و نصوص شرعیہ کے خلاف دیکھتی ہے تو اس کی جراءت اپنے اندر نہیں پاتی کہ قرآن و سنت کو مقدم رکھ کر اس قول مخالف کی تاویل کرے اور اس طرح شریعت الٰہی کو بھی اپنی جگہ چھوڑنے کی زحمت نہ دے اور پیشوایانِ اسلام کے دامن کو بھی مخالفت شریعت کے دھبے سے بچائے بلکہ برعکس اس کے کوشش کرتی ہے کہ اپنے پیشواؤں کی باتوں اور رایوں کو مقدم رکھ کر کسی نہ کسی طرح قرآن و حدیث کو ان کے مطابق کردکھائے، اگرچہ ایسا کرنے میں تاویل نصوص، تحریف نصوص تک پہنچ جائے! پہلی راہ بہ اعتبار اصل کے راہِ یہود ہے اور دوسری راہِ نصاریٰ اور اسلام نے دونوں کو بند کرنا چاہا۔

(تذکرہ، صفحہ ۵۵)

ہدایت اور اس کی قدامت:

ہدایت کی آواز کبھی بھی نئی نہیں ہوتی کہ دنیا کی یہ سب سے پرانی چیز ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۴۱)

خلاف عقل یا ماورائے عقل:

وہ ساری باتیں جن کا امکان انسانی دماغ میں آسکتا ہے، عقل کے مطابق ہیں۔ اس میں سے کوئی بات بھی خلاف عقل نہیں، البتہ اس کا کیا علاج کہ خود تمہاری ہی عقل راہِ خلاف میں گم ہے۔ تم نے تو آج تک یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ کسی بات کے ماورائے عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلاف عقل بھی ہو۔

(افکار آزاد، ص ۱۲۶)

(۲)

اگر تم غور کروگے **تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصلی** سرچشمہ یہی بات ہے یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے

بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے یا پھر سمجھ بوجھ کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی۔ اُسنے فوراً جھٹلادی۔ گویا حقیقت کے اثبات ووجود کا سارادارومدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص فرد کی سمجھ ادراک کرسکتی ہے یا نہیں۔ دونوں حالتیں علم وبصیرت کے خلاف ہیں اور دونوں کا نتیجہ عقل وبینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے۔ جس عقل وبصیرت کا تقاضا یہ ہوا کہ حقیقت ووہم میں امتیاز کریں۔ وہی متقاضی ہوں کہ کوئی بات محض اس لیے نہ جھٹلادیں کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عقل کا پہلا تقاضہ ہمیں وہم پرستی وجہل سے روکتا ہے۔ دوسرا شک والحاد سے۔ قرآن کہتا ہے۔ دونوں حالتیں یکساں طور پر جہل وکوری کی حالتیں ہیں اور اہل علم وعرفان وہ ہیں۔ جو نہ تو جہل ووہم کی راہ چلتے ہیں نہ شک والحاد کی۔

(افکار آزاد، ص ۷۵۔ ۱۴۷)

مبدءِ علم وسرچشمہ حکمت:

آپ کی راہ اُن راہوں سے بالکل الگ ہے۔ اور کتاب اللہ کی ہدایت وحکمت نبوت کی سنت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے تمام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کردیا ہے۔ آپ اس لیے نہیں ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں، بلکہ آپ کو علم وعمل شریعت اس لیے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف امید وطلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لیے اتباع وتقلید کا پیام ہو آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے۔ اور اُس کے رسول کی سنت ہے اور ان دوچیزوں سے بڑھ کر اور کون سا مبدءِ علم اور سرچشمہ حکمت ہوسکتا ہے جو انسانی اعمال کے تمام اصول وفروع کے لیے دنیا میں وجود رکھتا ہو۔

(خطبات آزاد، ص ۷۸)

پیغمبر کی صداقت کی کسوٹی:

اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ مہمات خصائص واعجازِ قرآن کے ہے۔ کسی پیغام کی صداقت جانچی نہیں جاسکتی، جب تک پیغام لانے والے کی صداقت وامانت نہ جانچی جاسکے، اور وہ ممکن نہیں جب تک اس کی پوری زندگی اور زندگی کے وقائع واعمال دنیا کے سامنے نہ ہوں۔ پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفۂ آسمانی ایسا ہے جو اپنے

لانے والے کی زندگی کے وقائع و سوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سنادے سکتا ہے تو وہ بحکم هذا كتابُنا ينطق عليكم بالحق بجز قرآن حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۰۷)

قرآن اور صاحب اسوۂ کاملہ کا باہمی یگانگت:

قرآن حکیم میں یا احکام ہیں، یا مواعظ و حکم ہیں، یا شرح قوانینِ ہدایت و ضلالت اور یا پھر قصص الاولین۔ تو معلوم ہے کہ اگر احکام ہیں تو اُسی شریعت کے جس کا حامل سید المرسلین ہے۔ مواعظ و حکم ہیں تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر واسوۂ کاملہ وجود سید المرسلین ہے۔ قصص ہیں تو انہی فضائل و مراتب کے جو سب کے سب مرتبۂ جامعیت محمدی میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہوگئے ہیں۔ پس اگر حضرات صوفیائے کرام نے تمام قرآن کو اسی ایک حسن اکمل و جمال بے ہمتا کی حکایت شمائل و شرحِ سراپا کہا، تو قطع نظر فسحتِ میدان اشارات کے ویسے بھی یہ کیوں موجب قدح و شک ہو؟ حق یہ ہے کہ "قرآن" اور صاحب سنت کی باہمی یگانگت و اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے۔ اُس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہیے۔ وللہ درماقال:

ماشئت قل فيه، فانت مصدق
فالحب يقضي والمحاسن تشهد!

(تذکرہ، صفحہ ۳۔۲۰۲)

مرکز حق و یقین ـــــ وحی الٰہی و حکمت نبوی:

یاد رہے کہ یہی فرق حکمائے سوء اور حکمائے حق کے طریق تطبیق عقل و نقل میں بھی ہے۔ پہلا گروہ انسانی نظریات و ظنون کو باہم علم مرکز حق و یقین قرار دے کر وحی الٰہی سے اس کے چاروں طرف طواف کرانا چاہتا ہے، اور دوسرا گروہ مرکزِ حق و یقین وحی الٰہی اور حکمت نبوی کو قرار دیتا ہے اور تمام انسانی معلومات و افکار کو اس کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اور راہ مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ تطبیق دونوں دیتے ہیں اور رفاقتِ علم و عقل کے دونوں مدعی، مگر دونوں کے طریق سیر و وصول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(تذکرہ، صفحہ ۶۰)

محبوب میں گم شدگی:

شرع کی اصطلاح میں اتباع سنت سے مقصود یہ ہے کہ تعلیم وتربیت امت کے باب میں آنحضرت صلعم کے جس قدر قولی و عملی سنن وکلم ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے اور جو سنن اعمال و طاعات میں ہیں ان کی بھی پیروی کی جائے لیکن تشبہ و تخلق بالرسول کا معاملہ ایک دوسری ہی وادی سے تعلق رکھتا ہے۔اس کا مبدا عقائد وافکار نہیں بلکہ یہ اصطلاح حضرات صوفیہ، ذواق و مواجید ہیں۔ یہ معاملہ صرف اتباع وتاسی ہی پر قانع نہیں رہتا؛اس سے بہت آگے نکل جانا چاہتا ہے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۳۵۰)

کتاب وسنت سے بُعد اور اس کے نتائج:

معلوم ہوا کہ اس زمانے میں حیلہ تراشیوں کی بنیاد پڑچکی تھی۔ یہ کتاب وسنت سے بُعد وہجر، اور ترکِ براہین ویقینیاتِ شرعیہ وتشبث بظن و تخمین بحت و تخرص وتلعب بظلماتِ اوہام واہواء وقیاس غیر صالح وغیر مؤید بالوحی کے شجرۃ الزقوم کے ابتدائی برگ وبار تھے جو آگے چل کر اس قدر پھلے پھولے کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ ان کے ثمرات ردیئہ وخسیسہ سے خالی نہ رہا اور وہ شریعت الاہیہ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "السمحة الحنيفية والمحجة البيضاء ليلا كنهارها" طرح طرح کے ظنونِ فاسدہ، وآرائے متشتۃ وقیاسات متخالفہ وسُبلِ متفرقہ وطرائقِ قددا و قواعدِ متناقضہ وتاویل الجاہلین وانتحال المبطلین و حیل المتحیلین واقیسۃ القیاسین ظلمات بعضها فوق بعض کا مجموعہ بنادی گئی۔ واللہ اکبر کبیراً ان یکون۔

(تذکرہ، صفحہ ۸۷-۸۶)

منصبِ نبوت کی کاملیت وخاتمیت:

منصب نبوۃ مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزء وحی وتنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع وتاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسئولانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے نبوت

آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (۵:۴)

لیکن منصب نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا، اور ضرور تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمر کے لیے "محدث" (بالفتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ مبشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا۔ "لم یبق الا المبشرات" حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی، اس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافتِ ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوامِ سیاست، قیادتِ فوج و حرب، فتح و عمرانِ ممالک، ریاستِ مجالس شوریٰ وغیرہ، جہاں بانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا، اس لیے ٹھیک اسی طرح خلافتِ خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری و عملی فرقوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحبِ امامت و خلافت بھی تھے۔ صاحب اجتہاد و قضاء بھی تھے، اور صاحبِ سیاست و نظم احکام و بلاد بھی۔ اصلاً "امامتِ کبریٰ" کا مقام اجتہادِ دینی اور سیاستِ ملکی دونوں سے مرکب ہے۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۱۶)

تفریق بین الرسل:

خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے، لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے۔ پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو، دوسروں کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا، ماننا نہیں ہے۔ بلکہ ایک زیادہ بری قسم کا انکار ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۴۱۰)

مرکز سعادتِ نوعِ انسانی:

جس طرح اجسام واشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقاء بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے، اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکزِ سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت وانقیاد بقاء و حیات کے لیے ناگزیر ٹھیری۔ (افکار آزاد، ص ۲٦۸)

نظام انسانی اور ان کے مرکز و محور:

ہمیشہ داعیان حق کا سب سے بڑا جرم شاہان ظلم و جور اور علمائے دجل و فساد کی نظروں میں یہی رہا ہے کہ دنیا ان کی طرف کیوں کھنچتی ہے؟ مگر افسوس کہ اس جرم سے وہ کسی طرح اپنے تئیں بری نہیں دکھلا سکتے جس طرح بینائی رکھنے والا دیکھنے پر مجبور ہے کہ خود اپنی آنکھیں پھوڑ نہیں سکتا، اُسی طرح علمائے حق اعلان و تذکیر حق میں ناچار ہیں کہ خدا کی دی ہوئی زبان کو کاٹ کر پھینک نہیں دے سکتے، اور بیانِ حق کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ دلوں میں گھر کرے اور ہر طرف سے انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لے۔ ایک داعی حق اور واصل باللہ اگر دینا سے کہہ بھی دے کہ میرے پیچھے نہ آؤ۔ جب بھی وہ اسی کے پیچھے دوڑے گی کہ جذب و انجذاب کا قانون الٰہی باطل نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر لوہا مقناطیس کی جانب کھنچتا ہے تو اس میں مقناطیس کا کیا قصور؟ یہ جرم ہے تو خدا نہ کرے کہ اس پاک جرم کے مجرموں سے کبھی اس کی زمین خالی ہو۔ یسقی بھم الغیث وینتصربھم علی الاعداء۔

خدا گواہ کہ گر جرم ما ہمیں عشق ست
گناہ گبر و مسلمان بجرم ما بخشند

نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں، مگر تم کو اُن کا حال نہیں معلوم! تم کو اجرامِ سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کے لیے کتنا زمانہ درکار ہوگا! تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکزِ محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہر

متحرک ستارہ صرف اسی لیے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے، اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکزِ انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں ہی پر موقوف نہیں۔ آسمانوں میں بھی صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔

(تذکرہ، صفحہ ۷۶۔۷۵)

ایمان بالرسل:

ترجمان القرآن میں کہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کے نزدیک نجات کے لیے ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ کم سے کم سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام میں پچاس ساٹھ جگہ ایمان بالرسل کا حکم آیا ہوگا۔ کیا آپ کو کوئی مقام ایسا ملا ہے جہاں اس کی یہ تشریح کی گئی ہو کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ اتنا ہی نہیں بلکہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں تو خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ قرآن کے نزدیک تفریق بین الرسل کفر ہے، یعنی سلسلۂ نبوت کی کسی ایک کڑی کا انکار بھی سب کا انکار ہے اور دروازۂ نجات بند کردیتا ہے ۔ اگر ''ایمان بالرسل'' ضروری نہیں تو تفریق بین الرسل کیوں کفر ہے؟

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۸۱)

نبی کا سب سے بڑا وصف:

نبی کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتلایا ہے وہ اس کی سچائی ہے۔ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے خواہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں۔ انبیائے کرام کی سچائی اور عصمت یقینیات دینیہ ونقلیہ میں سے ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۷۸۶)

تعلیم واسوۂ نبوت:

انسانی سعادت کے لیے تعلیم محض بالکل بیکار ہے، جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ

نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے، وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رولادے سکتی ہیں مگر اسکے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے سکتا ہے۔ لیکن اسکو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بُروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلادے سکتے ہیں، لیکن بُرے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے:

بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر سزا کے بعد!

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک اور مزکی انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لیے "اسوہ" کا حکم رکھتے ہوں۔ تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص، بلکہ اقوام و امم کے اعمال کو یکسر پلٹ دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لیے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا، بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ انکے حامل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلادیا۔

(خطباتِ آزاد، صفحہ ۲۳۔۲۲۲)

اصحاب واتباع رسول (صلعم) کا نمونہ علم و عمل:

حقیقت وہی ہے جس کو وحی الٰہی اور حاملین منصبِ نبوت علی الخصوص آخرہم واعظمہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب واتباع نے دنیا کے آگے پیش کیا، اور شک و ظن کی ظلمت و محجوبیت کی جگہ علومِ سماویہ و نبویہ کی یقینیات و براہین کا دروازہ نوع انسانی پر کھول دیا اور جس کے علم و عمل کا نمونہ سلف صالح و اوائل امت مرحومہ نے اخلاف و آخرِ امت کو ہمیشہ کے لیے دکھلادیا۔

(تذکرہ، صفحہ ۱۷۷)

ناممکن:

خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست وحکومت ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ط)

اسوہ و سنت کی ضرورت:

سعادت وہدایت انسانی کے لیے ”تعلیم“ کے ساتھ ”نمونہ“ اور ”کتاب“ کے ساتھ ”سنت“ ایک ضروری حقیقت ہے۔

(خطباتِ آزاد، صفحہ ۲۵۔ ۲۲۴)

اسوہ حسنہ کا درس:

حق و عدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز و شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظ جان و ناموس اور محبت فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں۔ لیکن اسوہ حسنہ مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و ہمت کو اچھی طرح آزمالیں ایسا نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے:

جرم راایں جاعقوبت ہست واستغفار نیست!

[مضامین ابوالکلام آزاد، (حصہ چہارم) ص ۹۴]

سیرت مقدسہ۔ اسلام کا دائمی معجزہ:

نہ صرف اُس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحب قرآن کی سیرت و حیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب و علل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحبِ قرآن کی سیرت ہے، اور دراصل قرآن اور حیات نبوت معناً ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اُس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اُس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس مابین الدفتین اور فی صدورِ الذین اوتوا العلم میں ہے، اور یہ ایک مجسم و ممثل قرآن تھا، جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقة رضی اللہ تعالیٰ عنہا: وکان خلقه القرآن:

ما دو جانے آمدہ در یک بدن
من کیم ؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست ؟ من

(تذکرہ صفحہ ۱۹۷)

وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت:

دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت ہیں۔ اس کے سوا علم و یقین کا اس سماء دُنیا کے نیچے وجود نہیں۔ اس کے ماسوا جس قدر بھی ہے، قرآن پکار پکار کے کہتا ہے کہ ظن ہے، تخمین ہے، قیاس ہے، اٹکل ہے، تخرص اور تلعب بالریب ہے، ظلمت ہے۔ ظلمات بعضھا فوق بعض ہے۔ علم، یقین، برہان، بصیرت، فرقان، النور اور نورٌ علیٰ نور تو صرف اسی اعلم الخلائق اور اعرف العباد کی درس گاہ سنت و حکمت سے مل سکتا ہے۔ جو شک کی جگہ یقین کا، جہل کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن ورائے کی جگہ بینہ و حجۃ کا، قیاس و تخمین کی جگہ برہان و فرقان کا اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ نور کا، تبیاناً لکل شی کا اور عروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا کا تمام نوع انسانی کے سامنے اعلان کر رہا ہے۔ اور تمام کرہ ارضی کو یہ کہہ کر بلا رہا ہے۔ ھٰذہٖ سبیلی ادعو آلی اللہ ۔علی 'بصیرۃٍ انا و منِ اتبعنی۔

(خطباتِ آزاد، صفحہ ۷۹۔۷۸)

محرومی و فقدان رحمت کا تدریجی تنزل:

نبوت و رحمت کی برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا، اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی، کالحصیر عوداً عوداً، جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی، اور جس قدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی، اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ قوام و نظام امت کے مبادیات و اساسات سے لیکر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک، ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔ فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھی جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابہ بالفتن) حضرت عمر (رض) کا وجود تھا۔ جوں ہی یہ بنیان مرصوص ہٹی، وہ سیلاب عظیم اُمنڈا، اور پھر کوئی سد و بند اسکی راہ نہ روک سکا۔ اسی سیلاب کو حضرت حذیفہ کی روایت میں "التی تموج کموج البحر" (رواہ البخاری) سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اس کی موجیں اٹھیں گی۔ سو واقعی اٹھیں، اور دور خلافت و رحمت اور "خلافتہ علیٰ منہاج النبوۃ" کی عظیم الشان عمارت اس کے تلاطم و طغیان میں آناً فاناً بہہ گئی۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۷۔۶)

قول فیصل:

میرے یقین کے لیے وہ بس ہے جو میرے اللہ کی کتاب اور میرے نبی کی شریعت نے بتایا ہے۔

(قول فیصل، ص....)

روحِ رواں کا طبیب:

جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن بیمار کے لیے شفقت اور ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن گنہ گاروں کے لیے سرتاپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں دہشت و نفرت پیدا کردیں، لیکن گناہوں سے پیدا کردیں، گنہ گار انسانوں سے نہیں اور یہی وہ نازک مقام ہے جہاں پیروانِ مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مذاہب نے چاہا تھا انھیں برائی سے نفرت کرنا سکھائیں، لیکن برائی سے نفرت کرنے کی جگہ انھوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنھیں وہ اپنے خیال میں برائی کا مجرم تصور کرتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔۱، صفحہ ۱۹۸)

امراض قلب و روح اور دارالشفائے وحی:

قلب و روح کی جتنی بیماریاں ہیں اصل مبدء ان کا دو قسموں سے باہر نہیں۔ ایک قسم مرض کا نام الحاد و انکار ہے۔ دوسری کا توہم و سوفسطائیت۔ باقی تمام بیماریاں اسی کے اتباع و عوارض و فروع ہیں۔ اور دونوں قسموں میں ظہور مرض کے علائم و آثار و عواقب مشترک ہیں۔ یعنی دونوں کا نتیجہ شک و جہل و اضطراب اور فطرت کی طمانیت اور سرور و راحتِ قلبی کا ازالہ یعنی باصطلاح قرآن حکیم نفسِ مطمئنہ کا فقدان۔ پس مرض بلحاظِ علت و ظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک و ظلمت، اور اس عالم میں وحی الٰہی اور حکمتِ نبوت اور ان سے ماخوذ و مکتسب کے علاوہ جو کچھ ہے "یقین" "برہان" "بصیرت" اور "فرقان" نہیں ہے، شک و ظن ہے، عدمِ علم و بصیرت ہے، یا تخمین و رائے اور تلعب و تخرص بالریب ہے۔ اور اسی لیے دعوتِ خاتم الادیان و مکمل الشرائع کی نسبت اکثر خطباتِ نبویہ میں یہ اعلان عام پاتے ہو کہ اُس

کا ظہور کرہ ارضی کے کمال جہل و فقدان علم کے وقتوں میں ہوا۔ یعنی اس لیے ہوا تاکہ علم و نور سے دنیا کو بھرپور کر دے، اور علم و نور نہیں ہے مگر یقین و زوال شک و ریب۔ علی الخصوص اولین خطبۂ جمعہ بالمدینہ میں فرمایا: ارسله بالهدیٰ والنور والموعظة علی فترة من الرسل وقلة من العلم، وضلالة من الناس "الخ۔ پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمتِ ظن و شک اور کوری وہم ورائے سے زیادہ نہیں، وہ مریضان یقین واعتقاد کے لیے کیوں کر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں؟ اور جو خود سرگشتۂ راہ اور واماندۂ کار ہے، وہ دوسرے گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے؟

جوہر طینتِ آدم زخمیرِ دگر ست
تو توقع زگِل کوزہ گراں می داری

بل هم فی شكٍ منها بل هم منها عمون (نمل) مرض کا ازالہ دوا سے ہو سکتا ہے، نہ کہ خود تولید مرض سے۔ اگر دنیا کا اصلی مرض "یقین" اور "بصیرت" سے محرومی ہے، اور شک و گمان کی ہلاکت، تو اُس کا علاج وہ کیوں کر کر سکتے ہیں، جن کا خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا منتہائے فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ " لا ادری ولا اعلم" ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس لیے ہے؟ یعنی بحکم وشهِدُ وَاعلیٰ انفسهم، وہ خود اپنے منتہائے معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں بتلاتے: ان نظن الا ظنا ومانحنُ بمُستیقنین۔

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس کا علاج اور نسخہ شفآء لمافی الصدور۔ تو صرف اُسی اعلم الخلائق واعرف العباد کے دارالشفائے وحی میں مل سکتا ہے جو شک کی جگہ یقین کا، ظلمت کی جگہ نور کا، عدم علم کی جگہ علم و بصیرت، کا ظن و قیاس و گمان کی جگہ بینہ وحجت کا، برہان و فرقان کا اور تبیاناً لکل شئیٍ اور عروة الوثقی کا، غرض کہ "لا ادری" اور "لا اعلم" کی جگہ "انی اعلم" اور "انی علی بینة من ربی" اور "انی اشهد" بلکہ "رایت وسمعت" کا دعوئ اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوع بشر کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو: هذه سبیلی ادعوا الی الله علیٰ بصیرة انا و من اتبعنی! اور تمام منکرین وجاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو: هل عند کم من علم فتخرِ جوه لنا؟ یعنی یہ علم ویقین اور خروج من ظلمات الجهل الی نورالمعرفة والحقیقة کی راہ ہے جس پر میں تم

کو دعوت دے رہا ہوں۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی "یقین" اور "علم و بصیرت" ہے، جس کو دنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو؟

(تذکرہ، صفحہ ۹۲۔۱۸۵)

اصل مرکز حق ویقین ــــ کتاب وسنت:

اصل مرکزِ حق و یقین کتاب و سنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا؟ سب کو اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا، سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔ لایومن احد کم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین۔ جب نصِ رسول کے مقابلے میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی، تو رسول احب کب باقی رہا؟ اربابِ افراط وغلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال واحوال کو بمنزلہٗ اصل مرکز بنا لیتے ہیں، جس کو کسی حال میں اُس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا، اور پھر چاہتے ہیں کہ وحیِ الٰہی وصاحب وحی کی نص کو اسکی جگہ سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ مرکز تک لے جائیں اور نہ جاسکے تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں۔ ستم یہ کہ اس طریق کو طریق توفیق و تطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ تطبیق ہے، تو والذی نفسی بیده کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا اور نہ کبھی اہل کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی۔

(تذکرہ، ص۵۸۔۵۷)

اعمالِ مہمہ وخصیصہ نبوت:

یہ بات کہ جس طرح ایک طبیب حاذق ہر طرح کی بیماریوں اور ان کے اسباب و آثار ونتائج کو جانتا، اور ہر عمر ومزاج کے بیماروں کا علاج کرتا ہے، اور کمالِ حذاقت وفراستِ طبیہ کی وجہ سے صرف چہرہ دیکھ کر یا نبض پر انگلیاں رکھ کر سب کچھ سمجھ لیتا اور پرکھ لیتا ہے، اسی طرح جماعت وملت کے تمام امراض جدیدہ ومزمنہ اور ظاہرہ ومخفیہ کا نباض ہونا، اور انسان کی، ذہنی ونفسی اور روحانی ومعنوی بیماریوں کو بہ یک نظر تفرس پہچان لینا، اور ٹھیک ٹھیک اُن کی حالت واستعداد اور مقتضیات کے مطابق درجہ بدرجہ علاج کرنا اور ہر مریض کو اُس کی حالت کے مطابق نسخہ دینا، اعمالِ مہمہ وخصیصہ نبوت میں سے ہے۔

(تذکرہ، صفحہ ۶۶۔۱۶۵)

طبیب امت: موسم شناس عالم معنی و حقیقت:

یہ بات اصحاب نظر کے لیے ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔اگر ایک تجربہ کار طبیب سات دن پہلے کہہ دے سکتا ہے کہ مریض جاں بر نہ ہو گا،اور اگر ایک جاہل مگر سال خوردہ دہقان ہوائیں دیکھ کر اور موسم کے قدرتی آثار جانچ کر بتلا دے سکتا ہے کہ بارش ہو گی یا نہیں، تو پھر کیوں تعجب ہو اگر ایک طبیبِ امت اور موسم شناسِ عالم معنی و حقیقت حالات و علائم دیکھ کر پکار اٹھے کہ حکومت مٹنے والی ہے،اور امت کی نزع کا وقت آ گیا!یا موسم جلد پلٹنے والا ہے ،اور قریب ہے کہ طوفان افق پر چھا جائے!اور یہ مثال بھی اس لیے دی تا کہ تمہارے فہم کی نارسائیوں پر گراں نہ گزرے ورنہ اصل حقیقت کا نقشہ اس سے بھی بلند تر کھینچا جا سکتا ہے،اور جمالِ حقائق تمثیلوں کی حجاب آرائیوں کا متحمل نہیں،عرفی نے خوب کہا ہے:

تو خفاشی،زنورِ مہ قیاسِ نور خورمے کن
ترا سودایں بود، گرنور خور بینی، زیاں بینی

اس سے بھی آسان اور موٹی سی بات کہتا ہوں۔اللہ کے قوانین وسننِ معنویہ اُسی طرح اٹل ہیں جس طرح مادیہ۔اس کو تم مانتے ہو، لیکن چونکہ اُن پر ویسا یقین نہیں رکھتے جیسا جسمانی قوانین مادہ پر ہے،اس لیے جزم و قطع کے ساتھ کبھی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ہر شخص کہتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ جلد یا بدیر تباہی ہے۔ لیکن چونکہ اس پر پورا یقین نہیں،اس لیے کبھی تمہیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی ظالم کی نسبت جزم و تحدی کے ساتھ دعویٰ کر سکو کہ ظلم کا زہر عنقریب رنگ لائے گا۔ حالانکہ اگر ایسا کرو، تو اس قانونِ حق کا بنانے والا کبھی تمہیں جھوٹا ہونے نہ دے،اور یہ بات بھی ویسی ہی سچی اور بدیہی نکلے جیسے زہر سے موت اور آگ سے جلن۔ برخلاف اس کے جب ایک دانائے حقیقت وصاحبِ ایمان وایقان کبھی کبھار نکل آتا ہے،اللہ اس کے دل کو نورِ یقینِ کامل و علم حقیقت سے معمور کر دیتا ہے، تو اس کو جس قدر یقین دن کی روشنی اور رات کی تاریکی پر ہوتا ہے،اُس سے کہیں زیادہ قانونِ حق و باطل و آئین صلاح و فساد پر ہوتا ہے۔وہ حالات دیکھ کر بلا تامل بتلا دیتا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے، کل کو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔اگر اجتہاد میں اُس سے غلطی نہ ہوئی، تو دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ٹھیک ویسا ہی ظہور میں آتا ہے۔اس پر تم سب تعجب کرتے ہو، حالانکہ اگر ایمان کی طاقت سے کام لو

اور قوانین الٰہی کو علم و نظرِ صادق کے ساتھ حالات و حوادث پر منطبق کرو، تو تم سب بھی ویسی ہی پیشین گوئیاں کر سکتے ہو جیسی ایک شخصِ خاص کرتا ہے، اور الہامِ حق کا دروازہ ایمان کامل کا ہاتھ تم سب پر کھول دے سکتا ہے۔ عرفیؔ یہی حقیقت کہتا ہے:

ہر کس نہ شنا سندہ ٔ راز ست، وگرنہ

ایں ھاہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست!

قرآن نے جابجا بتلادیا ہے کہ مصلحین حق و آمرین بالمعروف کا قتل کسی جماعت کی تباہی کا سب سے آخری کام ہوتا ہے۔ ویقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس اور ظلم کے ساتھ کبھی فلاح جمع نہیں ہو سکتی: انہ لا یفلح الظالمون۔

ہیچ قومے را خدا لعنت نہ کرد

تادلِ صاحب دلے نامد بدرد

(تذکرہ، صفحہ ۸۔۳۰۶)

ہدایت وحی اور اس کے پہنچانے والے:

ابتداء میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی۔ اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست، زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ وہ ان تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعے اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا "رسول" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے اور "رسول" کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، صفحہ ۲۵۲۔۵۳)

نبوت اور سچائی:

نبوت ایک سیرت ہے جو سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا، مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔اگر نبوت ہو گی تو سچائی بھی ہو گی۔اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۷۸۶)

نبوت کا مقام اور اس کی نیابت کاملہ:

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم وتربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے ان کو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے: یتلوا علیهم آیاته، ویزکیهم، ویعلمهم الکتاب والحکمة (۶۲:۳) تلاوت آیات۔ تزکیۂ نفوس۔ تعلیم کتاب و حکمت۔ خلفاء راشدین ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے۔وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تزکیۂ و تربیت بھی رکھتے تھے۔وہ ایک صاحب وحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے، ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکی بخشتے، اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنیوالے تھے۔وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہ و شافعی بھی تھے (رح) اور جنید و شبلی بھی (رح)۔ نخعی و حماد بھی تھے، اور ابن معین وابن راہویہ بھی (رح)۔ جسموں کا نظام بھی اُنہی کے ہاتھوں میں تھا۔دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں، اور اسی لیے ان کا وجود اور ان کے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین "اور اسی لیے" وعضوا علیها بالنواجذ" کے حکم میں نہ صرف سنتِ عہدِ نبوت، بلکہ خلافت راشدہ وخاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی، اور شرح اس سر الٰہی کی بہت طولانی ہے۔یہاں محض اشارات مطلوب۔

(مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب، صفحہ ۱۷)

کتاب اور حامل کا علاقہ وحدت و صداقت:

فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائص، قرآن و صاحب قرآن کے ہے۔آج تمام

ادیانِ حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں جس کی کتابِ الٰہی اور صاحب و حاملِ کتاب کے باہمی علاقۂ وحدت کا یہ حال ہو، اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ و ملحق اور باہم دگر شاہد و مشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حاملِ کتاب کی صداقت پر دلیل و شاہد ہو، اور حامل کتاب، اصل کتاب کی صداقت پر:

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!

حتیٰ کہ اگر تاریخِ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں، اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی صاحبِ شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی حقیقت اُسی طرح روشن و بین باقی رہے، جس طرح تاریخ و روایت کے دفاتر میں ہے، اور اگر دنیا چاہے تو اُس کی پوری سوانح عمری اور تاریخِ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوحِ محفوظ اور کتاب قیّم ہی سے بلا ایک نقطہ کی فروگذاشت کے مرتب کر لے!

(تذکرہ، صفحہ ۲۰۳)

قرآن اور کسی نئے ظہور پر ایمان:

اس بارے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، تیسری کوئی نہیں۔ یا تو نجات کے لیے وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے صاف صاف بتلا دیے ہیں یا پھر کافی نہیں۔ اگر کافی ہیں تو قرآن نے کہیں یہ حکم نہیں دیا ہے کہ کسی نئے ظہور پر ایمان لاؤ اور اگر کافی نہیں ہیں اور نئے شرائط نجات کی گنجائش باقی ہے تو قرآن ناقص نکلا اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اعلان ''الیوم اکملت لکم دینکم'' میں صادق نہیں۔

ہر مسلمان کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں جو راہ چاہے اختیار کر لے۔ اگر قرآن پر ایمان ہے تو نئی شرط نجات کی گنجائش نہیں۔ اگر نئی شرط نجات مانی جاتی ہے تو قرآن اپنی جگہ نہیں رہا۔ والعاقبۃ للمتقین۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۸۴)

ختم نبوت:

دین الٰہی بھی ایک عمارت ہے جس کی تعمیر ازل سے شروع ہوئی اور ختم نبوت کی آخری اینٹ نے اسے مکمل کر دیا، اس لیے وہ بھی اور عمارتوں کی طرح داخلی و خارجی اجزا سے مرکب ہے۔ پہلی قسم کے اجزا سے اس کی تقویم و ترکیب ہوتی ہے اور دوسری قسم کے اجزا نے

اس کے آب ورنگ اور اس کی زینت ورونق کو نمایاں کیا ہے۔

(رسولِ رحمت، ص ۶۲۴)

نجات وسعادت کی نئی شرط:

جو شخص کہتا ہے کہ نجات وسعادت کے حصول کے لیے یہ کافی نہیں اور کسی مجدد پر ایمان لانا ضروری ہے۔ وہ یا تو اسلام پر بہتان لگاتا ہے یا اسلام کی بو بھی اس نے نہیں سونگھی۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۸۵)

نجات وسعادت کی راہ:

سوال یہ ہے کہ جہاں تک نجات وسعادت کا تعلق ہے، اسلام کی دعوت کیا ہے اور وہ لازمی عقائد واعمال کیا ہیں، جن کے ماننے کا اسلام مطالبہ کرتا ہے؟

اس کا جواب تیرہ سو برس سے معلوم ہے! وہ چند گنے ہوئے عقائد واعمال ہیں، جو ہر انسان چند لمحوں کے اندر معلوم کرلے سکتا ہے اور جن کے علم وعمل میں کسی طرح کی پیچیدگی اور اشکال نہیں۔ان بنیادی عقائد واعمال کو مختلف تعبیروں میں ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً: دو شہادتوں کا اقرار اور چار عملوں کی تعمیل یا اس سے بھی مختصر اور جامع لفظوں میں ایمان اور اعمال صالح! ایمان میں ایمان باللہ، بالرسل، بالکتاب، بالآخرہ وغیرہا عقائد آگئے اور اعمال صالح میں ارکان اربعہ اور تمام حسنات معلومہ ومعروفہ۔ جو انسان بھی ان دونوں کو مان لے اور تعمیل میں لگ جائے، اس کے قدم نجات وسعادت کی راہ پر استوار ہو گئے۔

(نوادرِ ابوالکلام۔ ص ۹۔۸)

لسان نبوت:

خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے، وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۴۸)

مریض شک واضطراب اور توصیۂ مطالعہ سیرت کاملہ نبویہ:

انھوں (شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ) نے ایک ایسے صاحبِ علم (شیخ عمادالدین واسطی) مگر مریضِ شک واضطراب کو جو مدعیان علم وحکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین

واطمینان ضائع کر چکا تھا، یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیاتِ طیبہ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ۔ اور گویا اس طرح بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصلی سر چشمہ صرف حیاتِ نبوت اور منہاجِ مقام رسالت ہے، جس کو قرآن حکیم نے "الحکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیر اکثیر اً۔ کیونکہ دنیا میں "حکمتِ صادقہ" کا اس "حکمت" سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ "حکمت" یا تو خود منہاج و سنت نبوت ہے، یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اُس سے ماخوذ اور صرف اُسی پر مبنی ہو۔ یہی "خیر کثیر" مبدء جمیع خیرات و برکاتِ ارض و نوع ہے۔ اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں، خواہ شکوک وارتیاب کی بیماری ہو، خواہ اوہام وانکار کی، خواہ ادعائے ادریت کا ہیجان ہو، خواہ حیرانی و سر گردانی لاادریت کا خمار:

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہید!

کوئی بیماری ہو، دوا صرف ایک ہی ہے:

یکے دواست بدار الشفائے میکدہ ہا!

باقی یا تو اسمائے مختلفہ ہیں اور مسمیٰ وہی ایک ہے۔ مثلاً "سنت و سیرت" کی جگہ "قرآن و کتاب" کا لفظ بول دیا جائے کہ نام دو ہو گئے، مگر حکایتِ شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی بات وہی ایک رہی۔ دلالت و تسمیہ میں تعدد ہوا، مدلول و مسمیٰ میں نہیں:

عباراتنا شتی وحسنك واحد!

(تذکرہ، صفحہ ۸۳۔۱۸۲)

سیرت مبارکہ کی جامعیت کبریٰ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی۔ بلکہ ان ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں، اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قویٰ کی، جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں، اور جن کا آپ کے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا، اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی

طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستاں شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت وجہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں، اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے، بلکہ یہی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو، پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا، جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا، شریعت کا مقنن تھا، امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے ممبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت وہدایت کا واعظ تھا، تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا، اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمراں کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے، اور اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۱۵)

حدیث کی صحت:

اس تیرہ سو برسوں کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لیے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے، وہ اس کی صحت ہے، "عصمت" نہیں ہے اور "صحت" سے مقصود "صحت مصطلحہ" ہی ہے نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحت قرآن۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۷۸۵)

فریب نفس:

فن روایت کی گہرائیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ نیک سے نیک انسان بھی بعض اوقات جعل وصناعت کے تقاضوں سے اپنی نگرانی نہیں کرسکتے۔ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر کسی نیک مقصد کے لیے ایک مصلحت آمیز جعلی روایت گڑھ لی جائے تو کوئی برائی

کی بات نہیں۔ مسیحی مذہب کے ابتدائی عہدوں میں جن لوگوں نے حواریوں کے نام سے طرح طرح کے نوشتے گڑھے تھے اور جنہیں آگے چل کر کلیسا نے غیر معروف و مدفون نوشتوں میں شمار کیا، وہ یقیناً بڑے ہی دیندار اور مقدس آدمی تھے۔ تاہم یہ دینداری انہیں اس بات سے نہ روک سکی کہ حواریوں کے نام سے جعلی نوشتے تیار کر لیں۔

(غبار خاطر، صفحہ ۱۷۳)

معیار صحت

ہر واقعہ کی صحت و عدم صحت کے لیے پہلی چیز اصول روایت اور صحتِ نقل کے شرائط کا اجتماع ہے اور بس، نہ کہ زید و عمر کی عقل میں آنا!

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ سوم، صفحہ ۸)

علم و فضیلت:

علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمراں قوت ہے۔ سب کو اس کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص، ۸۳۲)

جہل و تعصب:

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلانِ حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی ہے۔ اس فیصلے میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے کرنا پڑا۔

(ترجمان القرآن، جلد چہارم، ص ۷۶۷)

علم حق:

علم حق ایک نور الٰہی ہے جو اغراض نفسانیہ کی تاریکی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

(صدائے حق، ص ۴۲)

فتنہ فقدان علم و زیغ نظر:

ساری مصیبت قلت و فقدان علم اور زیغ نظر و فہم کا ہے اور اسی نے ہر معاملہ علم اور ہر وادی عمل میں آفتیں برپا کر رکھی ہیں۔ نظریں کوتاہ ہو گئیں، معلومات درسیات و چند شروح کے اندر محدود ہیں۔ دین میں فقاہت باقی نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک بات کان میں پڑ جاتی ہے اور دنیا جہان کا فیصلہ اسی سے کر دیا جاتا ہے۔ (جامع الشواہد.... صفحہ ۱۳۷)

مدعیانِ علم و نظر کی خیرہ مذاقی:

اگر قوم میں کام کرنے والوں کی کمی ہے، تو چنداں شکایت نہیں، کام کرنے والے ہمیشہ کم ہی رہتے ہیں لیکن افسوس اس عالمگیر خیرہ مذاقی پر ہے کہ جو کام کرنے والے موجود ہیں، ان کے حسن و قبح کو پہچاننے والے بھی ناپید ہیں۔ تحسین ہے تو ناشناسانہ اور طعن ہے تو معاندانہ:

از ردو ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم
اے آنکہ خوب ما نشناسی ززشت ما

مرحوم غالب کو شکایت تھی:

غالب سوختہ جاں راچہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

لیکن قتیل نے تو پھر بھی اچھے شعر بہت سے کہے ہیں اور نافہمی کے لیے یہ مثال کچھ زیادہ درد انگیز نہیں۔

اس کا کیا علاج کہ آج کل کے بازار فہم و نقد میں جب حکمت و فضیلت کا ترازو ہاتھ میں لیا جاتا ہے تو بہت سے مدعیانِ نظر ہیں جن کو شاہ ولی اللہ اور مولوی نذیر احمد دونوں کے وزن میں کچھ فرق نظر نہیں آتا!

(الہلال، ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء، ص۸)

ہدایت و گمراہی کی ذمہ داری:

"انسان اپنی ہدایت و گمراہی کا ذمہ دار، اور اپنے فکر و دماغ سے کام لینے کے لیے خود مختار ہے۔ لیکن انسان کی تمام قوتیں نشو و نما کی محتاج ہیں اور نشو و نما ہو نہیں سکتی، جب تک قوتوں کو بغیر کسی سہارے کے خود ورزش کرنے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد۔ ۲، بدرالحسن، صفحہ ۴۰)

امتِ اسلامیہ کی شانِ وحدت:

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں "وحدہٗ لاشریک" ہے کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں۔ اسی طرح کا "قرآن کریم" اپنی

جامعیت اور کمال تعلیم میں "وحدۂ لاشریک" ہے اور بالکل اسی طرح اس کا لانے والا رسول کمال انسانیت و تعبد اور قوائے نبوت واصلاح میں بھی وحدہٗ لاشریک ہے، ان کی صفات وخصائص میں کوئی اُن کا شریک نہیں۔

"راہِ نسبت طلبی بیں کہ چہ شایاں رفتم"

پس ضرور ہے کہ جو امت اُس خدائے واحد، اس قرآن واحد اور اس رسول واحد کے دامن تعلیم سے وابستہ ہو، وہ بھی اپنے اندر اس شان وحدت ویکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمال زندگی کی ہر شاخ میں "وحدہٗ لاشریک" ہو، اس کے اعمال وخصائص بھی "من رانی فقدراالحق" کی صدائے اتحاد سے غلغلہ انداز عالم ہوں۔ تمام دنیا کی قومیں اس کے اعمال کا اتباع کریں۔ زندگی کے ہر حسن وجمال میں اس کے خال وخط مرقع عالم کے لیے نمونہ بنیں۔

(افکار آزاد، صفحہ ۹۹)

سوء ظن:

اگر مسلمانوں کے پاس لوہا نہیں بلکہ مقناطیس ہے تو مقناطیس اور لوہے کا جب آمنا سامنا ہوگا، نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کھنچے گا۔

یہ کیا مصیبت ہے کہ ہر بات میں اللہ اور اس کے دین حق کی نسبت "سوء ظن، ظن الجاہلیہ اور ہر معاملے میں خود اپنے نفس پر بحکم و شہد و اعلیٰ انفسھم شہادت بطلان وضعف وہلاکت۔

(جامع الشواہد.... صفحہ ۱۷)

حیلہ ترک عمل:

شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں اور بڑے ہی عبرت انگیز ہیں انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں۔ ادھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے۔ "یا مقلب القلوب یا محول الاحوال" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا تھا۔ جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو۔ دوسری طرف ختم خواجگان۔

دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں۔ مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم وہمت رکھتے ہیں بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

(غبار خاطر، صفحہ ۱۸۷)

خوش عقیدگی:

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ علماءِ ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے کہ انجاح مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (غبار خاطر، صفحہ ۱۸۶۔۸۷)

تین حالتیں:

قرآن نے انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں قرار دیں۔ ایمان، کفر، نفاق، تو فی الحقیقت عالم ہستی کے تمام گوشوں میں اصلاً تین ہی حالتیں پائی جاتی ہیں یا تو تکوین کی حالت ہو گی یا افساد کی حالت ہو گی یا ہر دونوں کی درمیانی حالت۔ خود اپنے وجود ہی کو دیکھ لو، یا زندگی ہے، یا موت ہے یا بیماری۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں، نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں کے بین بین ہے۔ لیکن رخ اسکا موت ہی کی طرف ہے۔ قلب و روح کا بھی یہی حال ہوا۔ ایمان زندگی ہے، موت کفر ہے اور انفاق بیماری۔

(ترجمان القرآن جلد سوم، ص ۴۵۵)

دردانگیز حقیقت:

میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے، اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں! (قول فیصل، صفحہ ۶۳)

جہادِ لسانی:

دنیا میں اصلاح کے بیج نے ہمیشہ سب سے پہلے "جہاد لسانی" ہی کی شاخ پیدا کی ہے اور یہ پہلی اینٹ ہے، جس پر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہیں اور بڑے بڑے شہر بسائے گئے ہیں۔ تمام انبیاء کرام اور رسل عظام جو اصلاح کی دعوت لیکر آئے، انھوں نے اپنے آلہی کاروبار کو وعظ ہی سے شروع کیا، ہمیشہ وعظ ہی کرتے رہے، اور دنیا سے رخصت بھی ہوئے تو وعظ ہی کرتے ہوئے۔ گویا اصلاح و دعوت ایک درخت ہے، جس کا بیج بھی وعظ ہے، جس کے لیے پانی بھی وعظ ہے۔ اور آخر میں جس کا پھل بھی وعظ ہی ہوتا ہے۔

(مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ، ص ۴۶)

مرتبہ انسانیت اور اس کا نصب العین:

انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہنچ کر نشوو ارتقاء کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں، اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود و بلندی کا نصب العین چاہیے جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔ اس کے اندر بلند سے بلند تر ہوتے رہنے کی طلب ہمیشہ ابلتی رہتی ہے۔ اور وہ اونچی سے اونچی بلندی تک اُڑ کر بھی رکنا نہیں چاہتی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اوپر ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اُس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

بلندی کا یہ نصب العین خدا کی ہستی کے تصور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بلندی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اسے نیچے کی طرف دیکھنے کے لیے جھکنا پڑے گا۔ اور جو نہی اس نے نیچے کی طرف دیکھا، انسانیت کی بلندی پستی میں گرنے لگی! (غبار خاطر، صفحہ ۱۴۹-۵۱)

سچے آنسو:

سچے آنسوؤں سے بڑھ کر عالم انسانیت میں کوئی شے طاقت ور نہیں ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ پنجم، صفحہ ۳۴)

ایک دن کی خوشی اور ہمیشہ کا ماتم:

یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک دن کی خوشیوں میں بے خود ہو کر ہمیشہ کے ماتم واندوہ کو بھول گئے ہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۱۰)

نتیجے کی فتح مندی:

دنیا میں سب سے بڑی نعمت الٰہی نتیجۂ کار کی فتح مندی اور ہمتوں اور عزموں کی کامیابی اور فلاح ہے۔

(صدائے حق، ص ۶۱)

انسان کی عالم گیر غلطی:

انسان کی ایک عالم گیر غلطی یہ ہے کہ وہ عبرت وبصیرت کے لیے ہمیشہ بڑے بڑے حادثوں اور وسیع الاثر مظاہر کا منتظر رہتا ہے۔ ہر صبح سے لے کر شام تک ہر انسان کی چھوٹی سے چھوٹی اور محدود سے محدود زندگی کے اندر جو صدہا صدائیں عبرت و موعظت کی بلند ہوتی رہتی ہیں، ان سے بالکل کان بند کر لیتا ہے۔ (مقام دعوت، ص ۱۰)

مواعظِ مسیحؑ کے مجازات و حقیقت:

معمولی سے معمولی کلام بھی بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوب روئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی، ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۹۳)

اعمال اور ان کے نتائج:

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے جو (حضرت یوسفؑ کے) بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عمل کا نتیجہ وہی ہے جو حضرت یوسفؑ کو ملا۔ صبر جمیل کبھی اس نتیجے سے محروم نہیں رہ سکتا جو حضرت یعقوبؑ کے حصے میں آیا تھا۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہو گا جو

امراۃ العزیز کو نصیب ہوا تھا۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۸۳۱)

کامیابی کی روح:

کوئی میدان ہو، وہ یقین کرتا ہے کہ کامیابی کی اصلی روح قربانی وایثار اور عملی اقدام ہے۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۳۲۶)

اعتدال عمل ـــــ فضل و کمال کا زیور:

قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی دورِ تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدال عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سوء استعمال اور افراط و تفریط عمل سے بداخلاقی اور صد عیبی کا دھبہ بن جاتی ہے موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا، تو مجلس سماع و نشاط سے اُن کی تھکن مٹاتا، اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں، دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا، کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقعہ دیتا، موسیقی کا شوق دونوں کو تھا، مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا، وہ محتاج بیان نہیں:

سارت مشرقة وسرت مغرب

شتان بين مشرق ومغرب

(غبار خاطر، ص ۳۳۶)

مقصد اور وسیلہ و ذریعہ:

دنیا کے ہر فکر، ہر عمل اور ہر سعی کو دیکھئے! آپ دیکھیں گے کہ ایک چیز وہ ہوتی ہے، جس کو "مقصد" کہتے ہیں اور ایک چیز وہ جو اس مقصد کو عمل میں لانے اور اس کے وسائل وذرائع سے عبارت ہے۔ مقصد نہیں بدل سکتا۔ نہ اس کو وقت بدل سکتا ہے اور نہ اور کوئی شے۔ البتہ ذرائع میں حسب حالت تبدیلی ضرور کرنی پڑتی ہے۔ کہ سنت اللہ اس کی مقتضی ہے

اور بغیر اس کے حصول فتح متعذر!

(تبرکات آزاد، ص ۲۸)

معاشرت کا فلسفہ اور اصلاح معاشرت کا عمل:

اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجئے اور ایک انجمن قائم کیجئے۔ ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو اُن پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں، ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائے گا، عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا، جس کے خصائص واعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاح معاشرت نہیں ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۰۴)

عدم یا وجود مع النقائص:

ابتدا میں کوئی کام بھی بلا انتظار و تدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے، نقائص رفتہ رفتہ دور ہو جائیں۔ عدم سے وجود مع النقائص بہ ہر حال بہتر ہے اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام ہو۔

(تبرکاتِ آزاد، ص ۹۶)

بد عملی کے اختیارات:

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بد عملی اور برائی کے لیے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں سب ایسی ہیں کہ اگر ان کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ گویا قرآن کے نزدیک برائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ حقیقتِ عدل سے انحراف ہو، مثلاً ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، افساد، اعتداء عدوان وغیر ذالک۔

"ظلم" کے معنیٰ "وضع الشی ٔ فی غیر موضعہ" کے ہیں، یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو بے محل ہو تو لغت میں اس حالت کو "ظلم" کہیں گے۔ اسی لیے قرآن نے

شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہے، کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا، ایک ایسی حالت ہے جو حقیقت عدل کے عین منافی ہے۔

"طغیان" کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گزر جانا۔ دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے۔ تو کہتے ہیں: طغی الماء، ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز عین عدالت کی ضد ہے۔

"اسراف" سرف سے ہے۔ "سرف" کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں جہاں خرچ کرنی چاہیے، اس سے زیادہ خرچ کر دی جائے۔

"تبذیر" کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ خرچ کرنا ہے جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ "اسراف" اور "تبذیر" میں مقدار اور محل کا فرق ہوا۔ کھانے میں خرچ کرنا خرچ کا صحیح محل ہے لیکن اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو یہ اسراف ہو گا۔ دریا میں روپیہ پھینک دینا روپیہ خرچ کرنے کا صحیح محل نہیں ہے۔ اگر تم روپیہ پانی میں پھینک دو تو یہ فعل تبذیر ہو گا۔ دونوں صورتیں عدالت کے منافی ہیں، کیونکہ حقیقت عدل، مقدار اور محل دونوں میں تناسب چاہتی ہے۔

"فساد کے معنی ہی "خروج الشیء عن الاعتدال" کے ہیں یعنی کسی چیز کا حالت اعتدال سے باہر ہو جانا۔

"اعتداء" اور "عدوان" ایک ہی مادہ سے ہیں اور دونوں کے معنی حد سے گزر جانا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۳۰۔۲۲۸)

شادی و غم:

دنیا میں کوئی شے نہیں جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن بھی نہ دیکھے ہوں۔ اور باغ میں کونسا زندہ درخت ہے جس نے خزاں کے جھونکوں کے ساتھ کبھی نسیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں؟ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ذرہ بھی قانونِ فطریہ وسلسلۂ علل واسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب حالت بھی ایک قانونِ الٰہی اور ناموسِ فطری کے ماتحت ہے۔ جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کیے ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

ولن تجد لسنة الله تبديلاً — اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں تم کبھی تبدیلی نہ دیکھو گے۔

(مقالات آزاد، عبداللہ بٹ، لاہور، ۱۹۴۴ء صفحہ ۶۴)

مصیبت کا غم اور استعداد کی قوت:

غم واندوہ صرف اس لیے ہے کہ مصیبت کی حس سے سعی واستعداد کی قوت پیدا ہو ورنہ آنسو بہا کر تو کسی سپاہی نے میدان جنگ فتح نہیں کیا۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۱۰۵)

نکتہ عمل:

ایک بہت بڑا نکتہ عمل یہ ہے کہ ہر قوت کا استعمال اس کے صحیح محل میں ہو۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ سوم، ص ۷)

خدا کی تعلیم:

پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بن کر نہیں۔ آپ کے ہاں اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر یہ بھی ہے کہ فرض کر لیجیے کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی، جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں ان میں تغیر و تبدل ہر وقت ممکن ہے البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لا تبدیلَ لکلمٰت اللہ ۔ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے؟

(افکار آزاد، صفحہ ۱۰۴)

وراثت ارضی:

قرآن کی زبان میں خلافت اور "استخلاف فی الارض" اور "وراثت و تمکن فی الارض" سے مقصود زمین کی قومی عظمت وریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت وسلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار حکومت قائم ہو، وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم وجور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے، ایک عام امن وسکون اور راحت وطمانیت دنیا میں پھیل جائے، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک نافذ و قائم ہے، اور

جس کو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری وساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت وامنیت کی ایک بہشت زار بنادے!

(افکار آزاد، صفحہ ۶۵۔۶۴)

حقیقت بینی کی آنکھ:

اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۲۳)

معیار شرف انسانی:

انسان کے لیے معیارِ شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں! ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی عظمت ورفعت کی تعمیر صرف اُسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۶)

نسب وخاندان کا امتیاز باطل:

انسان کی فطری ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لیے نسب وخاندان کے امتیاز باطل سے بڑھ کر اور کوئی روک نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جو انسان کو اس کی ذاتی قوتوں کے استعمال اور اُن کے ثمرات سے محروم رکھنا چاہتی ہے، اور اس خلافِ فطرت راہ کی رہنمائی کرتی ہے کہ ایک شخص کو باوجود عدم استحقاق ذاتی مستحق شرف سمجھا جائے اور دوسرے کو باوجود استحقاق ذاتی محروم کر دیا جائے۔ اسلام نے ان اکرمکم عند اللہ اتقا کم اور لیس للا نسان الا ما سعی کے قانون عام کا اعلان کر کے اسی مہلک انسانیت روگ کو مٹانا چاہا۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۸۰)

تنزل وادبار کی اصلی علت:

پہلے خلافۃ کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض

پادشاہی کے لیے اور فقہاء کا مجرد استنباط احکام و مسائل کے لیے رہ گیا، تو تزکیہ نفوس اور ارشاد قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی، جو بیعت توبہ وارشاد ہوئی، اور اسطرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا۔ وہ پادشاہ، مجتہد، مرشد، قاضی القضاۃ، سپہ سالار جنگ، میر عدل واحتساب، سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفقہ کے لیے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضاء کے لیے تیسرا۔ ارشاد و تزکیۂ قلوب کے لیے چوتھا۔ وھلم جرا۔ غرضکہ عہد اجتماع قویٰ و مناصب کے بعد دور انتشار قویٰ و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور وبلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں، یا اب مختلف وجود میں بٹ کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا، بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت وہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل وادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سرمست ہو۔ افسوس کہ سطحی و جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب وعلل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی، اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسباب ترقی و تنزل پر تدبر کرتے۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۱۸)

نزاعات کی سب سے بڑی علت کثرتِ اسماء کا فریب:

دنیا کے تمام نزاعات واختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشۂ عمل میں حقیقت و مسمّی کے اعتبار سے ایک ہی ہے، لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے، اور گو سب طلبگار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں، لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم دگر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد۔ دوسرا کہتا ہے عسل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ اختلاف مسمّی میں نہیں ہے۔ صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب و روز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے، لیکن اپنی اصطلاح و رسم میں

کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلافات سے لیکر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر و اسماء کے تمام پردے اٹھا دیے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے، تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں، اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے اگرچہ بھیس مختلف ہیں، اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں:

عبارا تنا شتیٰ وحسنك واحد

وکل الی ذاك الجمال یشیر

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ۳۴)

روا داری اور احتیاط:

فکر میں رواداری ہونی چاہیے، حکم میں احتیاط ہونی چاہیے (۱)۔

(ترجمان القرآن جلد دوم، مکتبہ مصطفائی لاہور، ص ۳۶۰)

ذہنی قوانین:

علم الاجتماع کے مطالعہ کرنے والے ایسے ہی احوال و تغیرات میں جماعت کے ذہنی قوانین کی جستجو کیا کرتے ہیں۔ جب آدمی بیکار ہوتا ہے تو ضرورت سے زیادہ سوچنے لگتا ہے۔ مشغول آدمی کو زیادہ خیال آرائیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہی حال جماعتوں اور قوموں کا بھی ہے۔ جس وقت تک وہ عملی زندگی میں مشغول رہتی ہیں، ذہن و فکر کو ضرورت سے زیادہ دقیقہ سنجیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جونہی ہاتھ پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں، ذہن و خیال ابھر آتا ہے اور اپنی کارستانیاں شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ارادہ کی ساری قوت عمل میں مشغول تھی۔ اب عمل کی جگہ تخیل کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ پہلے کسی کو ذہنی بلند پروازیوں کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی اب جس کسی کو دیکھو غیر ضروری بحثوں، بے محل کاوشوں، فرضی صورتوں تخمینی سوالوں، بے قید تخیلات اور مطلق العنان اوہام وظنون سے سرگرداں ہو جاتا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۱۴۱۔۱۴۰)

---

(۱)۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵۳ کی تشریح میں۔

دلوں کا انقلاب:

دلوں کی اقلیم میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب ہو جاتا ہے اور اسی انقلاب سے اس دنیا کے تمام انقلابات وابستہ ہیں۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

دعا:

دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہیں کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

(غبار خاطر، ص ۱۸۷)

جزئیات اختلافیہ کی ہنگامہ آرائی اور تقویٰ وطہارت کی فراموشی:

آج یہ حال ہے کہ اسلام وایمان کا سارا دارومدار محض چند جزئیاتِ اختلافیہٗ عقائد کی محافظت پر آکر ٹھہر گیا ہے اور صرف انہیں کے غرور و پندار میں ہر شخص مست رہتا ہے۔ عمل کی درستگی اور تقویٰ وطہارت کی اہمیت و تقدیم یک قلم فراموش کر دی گئی ہے، اور قریب ہے کہ اسلام کے ارکان و شرائط سے عمل صالح کا رُکن اس طرح معدوم ہو جائے گویا وہ کوئی ضروری چیز تھا ہی نہیں ساری جستجو اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کے عقائد کیسے ہیں؟ یعنی چند مزعومہ جزئیات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے؟ اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں انفاقِ جان ومال کا کیا حال ہے؟ تقویٰ وطہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھرپور؟ معاملات میں کیا حال ہے؟ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ، رفیق بھائی، وفادار شوہر اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے، یا ایک بے رحم وجود، بے حس پتھر اور موذی ومہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اُس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر چند اخلاقی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے، تو پھر ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی روئے زمین پر کوئی نہیں! یہی گمراہی یہود کی تھی کہ صرف اسرائیلیت کے غرور میں بدمست رہتے تھے۔ وقالوا لن تمسنا النارُ اِلا ایاماً معدودۃ۔ یہ غرورِ عقائد کا

فتنہ بہت ہی بڑا فتنہ ہے اور آج مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی اس سے گھلی جارہی ہے۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

(تذکرہ، صفحہ ۷۳۔۷۲)

دو مقصد ـــــ دفاعِ امت اور اصلاح احوال:

دو چیزیں ہیں۔ دونوں کے محل الگ ہیں اور وقت مختلف۔ ایک امت کی باہر سے حفاظت ہے، ایک اندر کی اصلاح۔ اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت یہ ہو رہی ہے کہ باہر سے دشمنوں کا احاطہ ہے اور اندر کا بھی ہر گوشہ محتاج اصلاح ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟ مقدم بیرونی حفاظت ہے یا اندرونی اصلاح؟ ہر صاحب علم و فہم تسلیم کرے گا کہ مقدم حفاظت ہے نہ کہ اصلاح۔ پہلے تدابیر امور کے لیے سعی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد اصلاح کا وقت آئے گا یعنی گھروں کی حفاظت کیجیے۔ جب حفاظت کی طرف سے اطمینان ہو جائے، پھر اس کی دیکھ بھال کیجیے کہ در و دیوار کا کیا حال ہے؟ سیدھی ہیں یا ٹیڑھی؟ خوشنما ہیں یا بدنما؟ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ابھی گھر تو باہر کے حملوں سے محفوظ ہوا نہیں اور دیواریں شروع کر دیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ سخت غلطی اور بے دانشی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ تو حفاظت ہو سکے گی جو مقدم ہے، نہ اصلاح ہی ہوگی جو مطلوب ہے۔ گزشتہ صدیوں میں کتنے ہی مصلحین کی کوششیں رائگاں گئیں کہ اس اصل عظیم پر نظر نہ تھی۔"

(تبرکات آزاد، صفحہ ۲٦٦)

انسانی کمزوری:

یہی انسانی کمزوری ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے اور اس کو "تطفف" سے تعبیر کیا ہے کہ ویل للمطففین الذین اذاا کتالو اعلی الناس یستوفون و اذا کالوھم اووزنوھم یخسرون !لین دین میں کم دینے والوں کے لیے کیا ہی تباہی اور ہلاکت ہے، جب وہ دوسروں سے لیتے ہیں تو وزن میں ٹھیک لیتے ہیں، پر دوسرے کو دینے کا وقت آتا ہے تو گھٹا گھٹا کے اور بچا بچا کے دیتے ہیں!!

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۵۴)

ترک واختیار کا اصول:

اگر یہ چیز کام میں آنے والی ہے تو اسے کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ ایک مفید چیز کو اس

لیے نظر انداز کر دینا کہ وہ غیر ملکی ہے غلط ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے آج آپ اگر اسی ترازو کو لے کر اپنی زندگی کو تولیں تو کتنی چیزیں آپ کو ہندوستانی نظر آئیں گی؟
(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۷۴)

انسانیت کی بقااور ذہنی مفاہمت:

انسانیت کا تحفظ اور اس کی بقا کادارومدار صرف ذہنی مفاہمت اور باہمی ہمدردی پر ہے۔ اگر یہ احساسات مردہ رہتے ہیں تو پھر تباہی و بربادی کے غار کا منہ کھلا ہوا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس میں دھکیل نہ دیا جائے۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۹۷-۹۸)

اسلام اور نفاق:

اسلام اور نفاق ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔
(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۲۶)

زندگی کا حاصل:

اگر آپ پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا؟ تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔

ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیے۔

دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں۔ حکایتِ تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں، زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آن کہ خاطر مجموع دیار ہم نشین دارد
سعادت ہم دم اوگشت ودولت ہم قرین دارد

(کاروان خیال، صفحہ ۷۰-۷۱)

فطرت انسانی اور اس کی طلب:

اس سے معلوم ہوا کہ بلندی کے ایک نصب العین کی طلب انسان کی فطرت کی طلب ہے، اور وہ بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے

سامنے، آئے اور سامنے جبھی آسکتا ہے کہ اس کے مطلق اور غیر متشخص چہرہ پر کوئی نہ کوئی نقاب تشخص کی پڑ گئی ہو:

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حسنِ بلند
کہ دلم راگلہ از حسرتِ دیدار تو نیست!

غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسنِ گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے، جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اُسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ ان ربك لبا لمرصاد اور واذا سئلك عبادی عنی ،فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذادعان۔

در پردۂ و برہمہ کس پردہ می دری
باہر کسی و باتو کسے راوصال نیست!

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے مگر صفاتی تصور نفی تشبہ کے ساتھ ایک ایجابی صورت بھی متشکل کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں صفات کی نقش آرائیاں ناگزیر ہوئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں علماء سلف اور اصحاب حدیث نے تفویض کا مسلک اختیار کیا، اور تاویل صفات سے گریزاں رہے۔

(غبار خاطر، صفحہ ۵۹۔۱۵۷)

انسانیت وحیات کی تاراجی:

جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے، اس کو فانی و وہمی الفتوں میں لگانا انسانیت وحیات کو تاراج کرنا ہے۔

(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، ص.....)

راہِ نجات وسعادت:

تمہارے لیے صرف ایک ہی راہ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گذرو گے اس وقت تک خدا کا قہر تم سے ٹھنڈا نہ ہو گا،

اور تم کبھی مراد اور خوش حالی نہ پاؤ گے۔ تمہارے سفر عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو اپنی تمام قوتوں اور تمام طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جھک جاؤ۔ اس کی سرکشی اور بغاوت چھوڑ دو۔ اس کے عشق اور محبت کو اس قدر پیو کہ بدمست ہو جاؤ اور اس کے آگے اس طرح گرو اور اس طرح روؤ اور اسقدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آ جائے۔ اور وہ تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھا لے اور سب کچھ تمہیں کو دے دے جس طرح کہ سب کچھ تمہیں کو اس نے بخش دیا تھا۔

(افکار آزاد، ص ۸۵۔ ۸۴)

غفلت کی خواری:

تم نے غفلت کو خوب آزما لیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ چکھ لی۔ تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لیے، تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہو گئی اور ایک اس کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی۔ پس مان جاؤ اور اب بھی باز آ جاؤ۔ گناہوں کو آزما چکے۔ آؤ تقوے اور راست بازی کو بھی آزما لیں۔ سرکشیوں کو چکھ چکے آؤ اطاعت کا بھی مزا دیکھ لیں۔

غیروں سے رشتہ جوڑ کر تجربہ کر چکے۔ آؤ اسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور راندگیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

افلا یتوبونَ اِلیَ	پھر کیا ہے کہ اب بھی تم اللہ کے آگے
اللهِ و یستغفِرونَ	نہیں جھکتے اور توبہ واستغفار نہیں
واللهُ غفورٌرّحیم"	کرتے حالانکہ اللہ تو بڑا ہی بخشش دینے
	والا اور بڑا ہی رحمت فرما ہے۔

(افکار آزاد، صفحہ ۸۶۔ ۸۵)

ایک لمحہ غفلت:

غفلت ہر حال میں غفلت ہے۔ ایک لمحہ غفلت کے معاوضے میں عمر بھر کا ماتم بھی کافی نہیں۔

(تذکرہ، صفحہ ۳۲۷)

صدائے حق:

دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اٹھی ہے، بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے غاروں کے اندر رہا ہے۔

(صدائے حق۔ ص ۶۴)

خدا کے جلال کا ظہور:

آفتاب کو ہمیشہ اس کی کرنوں میں دیکھا جاتا ہے، اور دھوئیں کو دیکھ کر مسافر پالیتا ہے کہ آگ جل رہی ہے۔ اسی طرح خدا کا جلال بھی ہمیشہ اپنی نشانیوں اور آیتوں کے اندر دیکھا گیا ہے اور ہمیشہ اس نے اپنے آفتابِ جمال کی چمک بدلیوں کے نقاب میں دکھلائی ہے۔

(افسانہ ہجر و وصال، ص ۱۴)

معمۂ نفس:

جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی:

تادست رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم!

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

(غبار خاطر، ص ۸۷۔۲۸۶)

فطرتِ بشری:

نوعِ انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ جمعیت بشری کی یہ

فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اکادکا ہوگا۔ بھیڑ بیوقوفوں ہی کی رہے گی۔ ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے۔ انکار پر آئیں گے تو مسیح کو سولی پر چڑھادیں گے۔ حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا:

گاوَ را دارند باور در خدائی عامیاں
نوح را باور نہ دارند از پے پیغمبری

اسی لیے عرفائے طریق کو کہنا پڑا:

انکارِ بے خلق باش، تصدیق اینست
مشغول بہ خویش باش توفیق اینست
تبعیتِ خلق از حقت باطل کرد
ترک تقلید گیر، تحقیق اینست

(غبار خاطر ص ۹۴۔ ۱۹۳)

حیات الٰہیہ:

دنیا میں ہر چیز مر جاتی ہے کہ فانی ہے، مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لیے جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں، کبھی فنا نہیں:

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(مقالات آزاد، ص ۲۳)

خاندانی تفاخر: عہد جاہلیت کی ایک یادگار مشئوم:

خاندان کے فخر کا بت بھی دنیا کے عہد جاہلیت کی ایک یادگارِ مشئوم ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مسلم چمار اپنے حسن عمل سے وہ مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے، اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے:

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

(تذکرہ، صفحہ ۲۷)

ایک بڑی نعمت الٰہی:

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے، ایک بڑی نعمت آبائے صالحین کے لیے یہ ہے کہ اولاد صالح عطا فرمائے۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۹)

مخلوق کی خاطر خالق کی نافرمانی:

بڑے سے بڑے مخلوق کی خاطر بھی خدا کا چھوٹا سے چھوٹا حکم نہیں ٹالا جا سکتا، اور نہ مخلوق کی خاطر خالق سے نافرمانی کی جا سکتی ہے۔ یہ اسلام کا، اور دراصل دنیا کی تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۵۶)

بقائے اصلح:

اس عالم میں بقا صرف اصلح کے لیے ہے اور بالآخر تمام غیر اصلح عقائد و اعمال کو ختم ہو جانا ہے، اور فیصلہ حق و باطل کی یہی سب سے بڑی شہادت ہے۔

(جامع الشواہد، ص ۷۳)

الفاظ کی پیدائش:

دنیا میں صرف انسان ہی پیدا نہیں ہوتے۔ الفاظ بھی پیدا ہوتے ہیں، اور جس طرح ایک عظیم انسان کی پیدائش دنیا کے انقلاب کی پیدائش ہوتی ہے اسی طرح بعض عظیم لفظوں کی پیدائش میں بھی عظیم انقلاب مضمر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ لفظ "قوم" کی پیدائش تاریخ کا انقلاب عظیم تھا، لیکن اگر کارلائل چند قدم آگے بڑھ سکتا تو دیکھتا کہ دنیا کا سب سے بڑا انقلاب لفظ قوم کی پیدائش نہیں بلکہ "انسان" کی پیدائش میں مضمر ہے۔ کون ہے جو اس انقلاب کی عظمت کا نقشہ کھینچ سکتا ہے!

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۱۸۱۔۱۸۰)

دل مردہ اور شاہد حقیقت کا نظارہ:

غور کرو جس مردہ دل کو کبھی یہ وقتِ خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ملنے کے تصور میں اپنے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے اس کو شاہد حقیقت کا نظارہ حواس ظاہری سے کب ہو سکتا ہے، جس افسردہ نفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگس خواب

آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں اس کو معشوق حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہو سکتی ہیں جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی اور وجود آرائی کے بت کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حس کو کسی پیکر حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت ولا یعقل نہ کر دیا ہو۔ اس کو ساز ازل کی نغمہ سرائی پر کیونکر وجد آئے غرضے کہ جس بدنصیب کو کسی مستِ حسن کی نگاہِ بے محابا بے خود نہ کر سکی اسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے لیکن نئے فتیلہ کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے:

محبت بادل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود تر گیرد

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص۱۹۔۲۱۸)

مسلمانوں کی تعلیم سعادت:

کوئی قوم اس لیے نہیں بگڑتی کہ اُس نے اپنی تعلیم سعادت کی فروعات کو چھوڑ دیا۔ بلکہ اس لیے کہ اصول و کلیات کا سر رشتہ اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ جب تک جڑ میں زندگی ہے، اسوقت تک درخت کا ایک پتہ بھی خشک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر جڑ کو پانی نصیب نہیں تو شاخوں اور پتوں کے اوپر سمندر کے سمندر بھی اونڈیل دو، وہ سر سبز نہیں ہو سکتے۔

(اذکار آزاد، صفحہ ۱۴۸)

اسلام کا فلسفۂ دولت:

اسلام نہیں چاہتا کہ ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں کھلی رہتی ہیں یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور کافروں کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اُن کی مٹھیاں بند ہوتی ہیں۔ یعنی نیک کاموں پر وہ خرچ نہیں کر سکتے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی شخص کی اجارہ داری میں آجائے یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگائے۔ اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے اس کا یہ اصول زکوۃ اور وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بارہ میں سوشلزم اور اسلام کے اصول ایک ہی ہیں ایسا

کہنے والے نہ صرف یہ کہ غلط کہتے ہیں بلکہ دیانتداری کے خلاف کہتے ہیں۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ دولت کی برابر تقسیم ہو۔ اگر ایک آدمی کے پاس سو روپے ہوں تو سب کے پاس سو سو روپے ہونے چاہئیں۔ لیکن اسلام یہ نہیں کہتا۔ اسلام صرف یہ کہتا کہ ہر شخص کے پاس روپے ہوں۔ اسلام حق مساوات تسلیم کرتا ہے لیکن مقدار مساوات تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب ایک آدمی پیدا ہو تو اس کی زندگی سوسائٹی پر فرض ہو گئی۔ سوسائٹی کا فرض ہے کہ اسے زندہ رہنے دے اسلام نے اقتصادی مساوات تسلیم نہیں کی ہے۔ بے شبہ اسلام میں اونچ نیچ کوئی طبقہ نہیں ہے لیکن اسلام نے غرباء اور امراء کے طبقات تسلیم کیے ہیں۔ قرآن حکیم میں خداوند کریم نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ ہم نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ سوشلزم جس قسم کی مساوات پیش کرتا ہے وہ بالکل غیر فطری ہے دنیا کا وجود ہی کشاکش پر قائم ہے پھر غیر فطری مساوات کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آج دنیا میں سوشلزم اور اشتراکیت کے اصول پھیلائے جا رہے ہیں اور دنیا ایک اصول کی تلاش میں سرگرداں ہے اگر آج ساری دنیا اسلامی اصول اختیار کر لے تو سوشلزم اور اشتراکیت کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی صرف اسلامی اصول ہی دنیا کی پیاس اور تشنگی کو دور کر سکتا ہے۔

(خطباتِ جمعات و عیدین، ص ۵۔۴)

اصلاح رسوم و عوائد اور مجرد بحث و نظر:

جن مفاسد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں سے ہے، لیکن اس بارے میں سب سے پہلا سوال طریق اصلاح کا ہے۔ کسی جماعت کے رسوم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا، ایک ایسا کام ہے جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یعنی دلائل و معلومات کی اشاعت اس کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک تعلق احساس و اعتراف مفاسد اور معلومات مانعہ کا ہے، بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلیں گے جو ان سے بے خبر ہوں یا ضرورت اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں، تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات و بواعثِ مفاسد کا عزم و ہمت سے مقابلہ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فضائل

عملیہ کا یہی حال ہے۔ مجرد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے نہ ہو گا۔
(تبرکاتِ آزاد، ص ۱۰۳)

ذہنیت میں تغیر:

یہ جو روایات و آثار میں تم جا بجا پڑھتے ہو کہ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا مجھے مشکلات پیش آئیں، سونچا کیا کروں؟ دل نے فیصلہ کیا کہ نماز پڑھو۔ ابو سعید کہتے ہیں، ایک مرتبہ راستہ بھول گیا۔ کوئی بتلانے والا دکھائی نہ دیا۔ میں نے نماز شروع کر دی۔ ایک دوسرے صحابی جب چوروں میں پھنس گئے اور بہ ظاہر اعانت کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو نماز شروع کر دی اور اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں، تو ان کے اندر بھی اسی عہد کی ذہنیت کا مطالعہ کرو۔ یہ ذہنیت پھر بتدریج متغیر ہوتی گئی، یہاں تک کہ یہ وقت آگیا کہ اب اگر کسی مسلمان کو مشکلات پیش آتی ہیں تو کسی حال میں بھی اس کا ذہن نماز کی طرف یا تلاوت قرآن کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے، یہ ہوتی ہے کہ فلاں درگاہ کی منت مانوں، فلاں عرس میں چادر چڑھاؤں، فلاں مقام پر بکرا ذبح کروں۔ غور کرو اُن کی دماغی بناوٹ اور قلبی حالت کیا تھی اور ہماری کیا ہو گئی ہے؟ رونا مجرد ان اعمال و رسوم پر نہیں، یہ تو کسی شجر فکر کے برگ و بار ہیں۔ ساری مصیبت اس دماغی و فکری حالت کے انقلاب میں مضمر ہے جس سے تمام انسانی اعمال پیدا ہوتے ہیں اور اس پر ارادہ و فعل کا دار و مدار ہے:

سارت مشرقة وسرت مغربا

شتان بين مشرق ومغرب

(تبرکات آزاد، صفحہ ۴۹۔۳۴۸)

ظلم و عدوان کا دائمی رنگ و فساد:

جس طرح حق و عدالت کا ظہور یکساں رہا ہے، اسی طرح بطلان و فساد کا ظہور بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ جس طرح حق کی صدائیں ہمیشہ ایک ہی طرح اٹھی ہیں، اسی طرح ظلم و عدوان کے دعوے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے ہیں۔ جس طرح حق و ہدایت کی شکل و صورت اور خصائص و اوصاف ہر عہد میں ایک ہی طرح کے رہے، اسی طرح بطلان و فساد کا رنگ روپ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۸۹)

غلط فہمی اور جہل:

غلطی اور غلط فہمی برداشت کی جاسکتی ہے، لیکن جہل و تعصب کا کیا علاج ہے؟ جن گرفتارانِ جہل نے سمجھ بوجھ کر انصاف کے خلاف قسم کھالی ہو، انھیں کوئی سمجھائے تو کیوں کر؟ ہم علم وانصاف سے اپیل کر سکتے ہیں، لیکن علم وانصاف خلق نہیں کر سکتے۔

(تبرکاتِ آزاد، ۷۶-۲۷۵)

راہ مقصد کی خاک:

راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی:

خاکِ کویش خود پسند افتاد درجذبِ سجود
سجدہ از بہر حرم نہ گزاشت در سیمائے من!

(غبار خاطر، ص۷۲)

انسان کا گھمنڈ:

انسان کا گھمنڈ دور کی فتح مندیاں دیکھ لیتا ہے، لیکن قریب کی بدبختی اسے نظر نہیں آتی۔

(تبرکات آزاد، ص۳۸۹)

زندگی اور مقصد:

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
سرمد بہ مئے و پیالہ ربطے دارد

(غبار خاطر، ص۷۰)

انسان اور درندہ:

انسان یقیناً انسان ہے۔ پر وہ درندہ بن جائے تو درندوں سے بھی بدتر ہے۔

(مقالات آزاد، ص۱۱۰)

پانے کا مزہ:

یہاں پانے کا مزہ انھیں کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص۷۹)

ادائیگی فرض:

انسان کا اپنا فرض نہ ادا کرنا ہمیشہ اس کے لیے موجب تاسف و تالم ہوتا ہے۔

(تبرکات آزاد، ص۱۲۰)

تحسین کا مستحق:

ہر طاقت ور ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لیے ہے، جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کرلے۔

(نقوش ابوالکلام ازاد، ص۸۰)

صبح وداع کی اداسیاں:

دنیا کسی کے لیے کبھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن اگر تم خود بدل جاؤ تو اس کو بھی یک قلم بدلا ہوا پاؤ گے۔ تمہاری دنیا تمہارے میکدۂ شباب میں ایسی تو نہ تھی جیسی اب بڑھاپے کی پامالیوں میں نظر آرہی ہے؟ شامِ وصال میں تمہاری یہی ہر روز والی دنیا جو رعنائیاں رکھتی تھی، صبح وداع کی اداسیوں میں کب باقی رہیں؟

گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں ہے اب!

(تذکرہ، ص۳۲۶)

میدانِ کارزار کی فیروزمندی:

دنیا ایک میدان کارزار ہے اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو دراصل یہ ایک حریفانہ کشمکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں۔ وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے، اسے کامیابی وناکامی اور فیروزمندی ونامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری ہی تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر و سینے میں بھی زخم کے نشان پائیں؟ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، لیکن سپاہی کو زخم پر زخم کھا کر بھی اف

نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں بلکہ میدان جنگ ہے۔

شکست وزخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو۔ اور تلووں کو بچانا چاہتے تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے تو ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو۔ کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنہ سہلایا اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو؟ مایوسی خودکشی ہے اور امید زندگی۔ اور زیادہ چابک دستی سے پیکارو جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیوں کہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے، زیادہ ہمت مطلوب نہ تھی، لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے۔

(مقالاتِ آزاد، ص۷۶۔۷۵)

افراد کی وقتی فیاضیاں:

اصل یہ ہے کہ افراد کی وقتی فیاضیاں کتنی ہی زیادہ ہوں، قوم کی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے کبھی کفیل نہیں ہو سکتیں۔

(ترجمان القرآن، حصہ سوم، ص۴۳۰)

فطرت کا افادہ و فیضان:

فطرت کے افادہ وفیضان کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن وزیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظرافروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رخ نہیں، جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقابِ زیبائش نہ ڈال دی ہو۔

(ترجمان القرآن جلد اول، ص۱۰۲)

خلقت و ہستی کا قوام (معنوی عناصر):

جس طرح کارخانۂ خلقت اپنے وجود وبقاء کے لیے ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے، اسی طرح عدالت کا بھی محتاج ہے۔ یہی تین معنوی عنصر ہیں۔ جن سے خلقت و ہستی کا قوام

ظہور میں آیا ہے۔ ربوبیت پرورش کرتی ہے، رحمت افادہ وفیضان کا سرچشمہ ہے اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی اور نقصان وفساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد اول ص....)

ذہنی قوانین:

علم الاجتماع کے مطالعہ کرنے والے ایسے ہی احوال و تغیرات میں جماعت کے ذہنی قوانین کی جستجو کیا کرتے ہیں۔ جب آدمی بیکار ہوتا ہے تو ضرورت سے زیادہ سوچنے لگتا ہے۔ مشغول آدمی کو زیادہ خیال آرائیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہی حال جماعتوں اور قوموں کا بھی ہے۔ جس وقت تک وہ عملی زندگی میں مشغول رہتی ہیں، ذہن وفکر کو ضرورت سے زیادہ دقیقہ سنجیوں کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جونہی ہاتھ پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں، ذہن وخیال ابھر آتا ہے اور اپنی کارستانیاں شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ارادہ کی ساری قوت عمل میں مشغول تھی۔ اب عمل کی جگہ تخیل کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ پہلے کسی کو ذہنی بلند پروازیوں کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی اب جس کسی کو دیکھو غیر ضروری بحثوں، بے محل کاوشوں، فرضی صورتوں، تخمینی سوالوں، بے قید تخیلات اور مطلق العنان اوہام وظنون سے سرگراں ہو جاتا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۱۴۱۔۱۴۰)

طمانیتِ قلب:

میں زندگی بھر کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیتِ قلب کا مقام بغیر ذوق وصال کے میسر نہیں آتا۔ ومن لم یذق لم یدر۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۷۹)

زندگی کا حاصل:

اگر آپ پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا؟ تو بلا تامل کہہ دوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہیں دی!

ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی اس لیے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیے۔

دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں۔ حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں! اگر عیشِ حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو، جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے:

ہر آں کہ خاطر مجموع دیا رِ ہم نشیں دارد
سعادت ہم دم او گشت و دولت ہم قریں دارد

(کاروانِ خیال، صفحہ ۷۱۔۷۰)

جانے والے کا ماتم یا باقی کی فکر:

لوگ اس پر ماتم کرتے ہیں کہ جانے والے چلے گئے، مگر کسی کی آنکھ نہیں روتی کہ جو باقی ہیں ان کی خبر لیں۔ (البلاغ، کلکتہ، ۲۵؍ فروری، ۱۹۱۶ء)

ذہنی مفاہمت:

انسانیت کا تحفظ اور اس کی بقا کا دارومدار صرف ذہنی مفاہمت اور باہمی ہمدردی پر ہے۔ اگر یہ احساس مردہ رہتے ہیں تو پھر تباہی و بربادی کے غار کا منہ کھلا ہوا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس میں ڈھکیل نہ دیا جائے۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۹۸۔۲۹۷)

میانہ روی:

قوموں کی زندگی میں دو عملی کا زمانہ نہایت تاریک زمانہ ہوتا ہے۔ اس کوشش میں قوموں نے یا تو افراط کی راہ اختیار کی ہے یا تفریط کی، اور یہ دونوں راہیں غلط ہیں۔ فکر و عمل کی طرح زندگی کی راہ تو میانہ روی میں ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جتنی بھی راہیں ہیں، غلط ہیں۔ تباہی و بربادی کی راہیں ہیں۔

(صدائے حق، مرتبہ مسعود الحسن، ص ۶۷۔۶۶)

اعتماد کی جگہ:

زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے، نہ کہ کسی کی چوکھٹ!

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، ص ۱۲)

اسلام کی حقیقت:

اسلام کی حقیقت بینی نے اعمال انسانیہ کو صرف اسی نظر سے نہیں دیکھا کہ اُن میں

مضرت بالفعل ہے یا نہیں؟ بلکہ ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ وہ موصل الی الفساد تو نہیں ہیں؟ اور دنیا اپنی اصلاحِ آخری کے لیے صرف اسی نظر کی منتظر تھی۔

(افاداتِ آزاد، ص ۷۸)

معیار شرف انسانی:

انسان کے لیے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے، نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں! ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے۔ اور اپنی عظمت ورفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔

(تذکرہ، صفحہ ۲۶)

بزم وانجمن کی پرسش نہانی:

بزم وصحبت کی ادب آموزیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک ایک گھونٹ کی لذت لے کر جام خالی کیجیے، توئے پرستوں کی یہ مستیاں چاہتی ہیں کہ کسی گوشے میں چھپ کر پوری صراحی منہ سے لگا لیجیے۔ بزم وانجمن کی پرسش نہانی و دزدیدہ نگاہی کا بھی ایک لطف ہے، اور خلوت و تنہائی کے راز و نیاز کا بھی ایک عالم ہے۔

(تذکرہ، ص ۳۳۴)

شک کا مرض اور اس کا علاج:

یہ نقطہ بھی پیش نظر رہے کہ انسانی معلومات کے عدم سے حقیقت معدوم نہیں ہو جا سکتی، اگر کسی دوا کا خاصہ ابو بکر رازی و ابن بیطار سے پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھا، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں اس سے پہلے وہ دوا موجود بھی نہ تھی۔ کونین ہمیشہ سے موجود، اور جب سے موجود، اسی وقت سے دافعِ تپ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا خاصہ تمہیں کال معلوم ہوا۔

بہر حال یہ مثال بعینہٖ امراضِ معنویہ از قبیل شکوک و شبہات و انکار وجحود اور ان کے علاج کی بھی ہے۔ شک و شبہہ و انکار کا مرض ایک ہی ہے اور اس کا علاج بھی ایک ہی ہے۔ ہمیشہ سے یکساں مرض، اور ہمیشہ سے یکساں علاج، یہ بات نہیں ہے کہ معلومات و مکشوفات

کے بدلنے سے وہ بھی بدل جائے۔

(تذکرہ، صفحہ ۷ ۳_۲۳۶)

سفر کی کامیابی اور نامرادی:

سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے، نہ مختلف راہوں پر۔ راہ کوئی ہو، قدم میں حرکت اور ہمت میں اقدام ہے، تو کبھی نہ کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ خواہ راہ میں ہر درخت کے سائے تلے دم لو، خواہ ہر سرائے میں کمر کھولو۔ لیکن ساری نامرادی و بے حاصلی اس کے لیے ہے جس کے لیے راہ و منازل کے تماشے اس طرح دامن گیر ہو گئے کہ وہیں ہمیشہ کے لیے بستر جمادیا:

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو!

ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے! کوئی درمیانی منزل ہو، اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے، تو پھر وہی منزل بت ہے اور رہرو اس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔ من شغلک عن اللہ فھو صنمک۔ کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے کہ:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے، اور چل نکلے

اور نامرادی نہیں ہے، مگر اٹکنے اور رہ جانے میں:

یک لحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(تذکرہ، ص ۲۲_۳۲۱)

اعتراف و تکذیب کے حدود:

قرآن نے بہ یک وقت دونوں باتوں کی مذمت کی ہے:

☆ اس کی بھی کہ بغیر علم و بصیرت کے کوئی بات مان لی جائے اور

☆ اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بناء پر کوئی بات جھٹلادی جائے۔

(ترجمان القرآن، جلد سوم، ص ۵۸۹)

اندیشۂ غم:

انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی شقاوت

کی ساری سرگذشت انھیں دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو اور دیکھو! خواہ جسم میں چبھتے ہوں، خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی، تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں: یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔

قرآن کہتا ہے: ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے۔ جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غم گینی۔ (ترجمان القرآن، جلد سوم، ص، ۹۶۔۵۹۵)

بقائے اصلح کا قانون:

جس طرح مادہ اور اجسام میں انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا قانون جاری ہے، اور فطرت صرف اسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح و اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے۔ آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہو، اور اس لیے باقی و قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا، تو آخری جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی: واما ما ينفع الناس فيمكث فى الارض كذلك يضرب الله الامثال ۔(۱۸:۱۳) زمین پر وہی چیز باقی رہے گی جو نافع ہو۔ غیر نافع چھانٹ دی جائے گی۔

(قول فیصل، صفحہ ۷۷)

زندگی کی خواہش:

ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے؟ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابل ملامت ہو، لیکن زندگی کی خواہش قابل ملامت نہیں ہے۔ (قول فیصل، ص ۳۶)

قانون قدرت:

انسانی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے اس کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے، اُسے چھانٹ دیا جاتا ہے۔ فاما الزبد فيذهب

جفاءً واماما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

(غبار خاطر، ص ۲۹۵)

نزول مصائب اور توصیۂ عزم وہمت:

غموم وہموم کا نزول جس طرح ہمت سوز اور یاس انگیز ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی عزم وشجاعت کے مُردہ ولولوں کو زندہ بھی کر دیتا ہے۔ اور مبارک ہے وہ قوم جو نزولِ مصائب پر مایوسی وعطالت کی جگہ ہمت وعزم سے کام لیتی ہے۔

(مقالاتِ آزاد، ص ۱۰۳)

طلب مفرط:

طلبِ مفرط جس چیز کی بھی ہے، انداد وطواغیت میں داخل ہے۔

(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، ص......)

حقیقت ہجرت:

یہ دنیا کی علمی وتمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت وفلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج وثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد وعزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام وراحت سے مفارقت نہ کر جاتے، اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش، اہل وعیال کی محبت، خویش وبیگانہ کی الفت، اور ملک ووطن کی دامنگیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہِ ہجرت میں قدم نہ اُٹھاتے، تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے، اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پیٹھ پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم وفنون موجود ہیں اُن سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولۂ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا؟ کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کیں، دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے، جب کہیں جا کر فنِ طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویہ واشیاء کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے، اگر

مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے، اور گھر کے آرام وراحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارانہ کر لیتے، تو اشیاء کی تحقیق کیونکر ہوتی؟ پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتی؟ جغرافیہ کیونکہ وجود میں میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں؟ نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا، تو آج دنیا کا نصف تمدن ناپید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی سربفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت اُن کے گھروں میں کھنچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں، اور یکسر قربان وہلاک ہو جائیں، تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبۂ نوع پرستی کی انتہا ہے۔ لیکن اگر اُسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ ''ہجرت'' سے تعبیر کرے، تو تم اس کا انکار کردو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سیکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں۔ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ ''کشش ثقل'' کا قانون دریافت کرلے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے۔ لیکن اگر تم عزم وطلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے؟

(افکار آزاد، ص ۷۳۔۷۱)

ترازو کی ضرورت:

آج ہم ایک وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے۔ اور دوسری مایوسی اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا اور اگر کم کر کے دیکھا تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے نہ خائف، ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے، جب ہم مشکلات کا صحیح صحیح اندازہ کرلیں۔ ہمیں اس راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

(افکار آزاد، ص ۹۵)

ڈاکو اور سود خور:

اصل یہ ہے کہ کسی خود غرضی کے عمل اور بے رحمی کے کام میں اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں ہے، جیسی کسی کاروباری بے رحمی میں۔ قاتل ایک شخص کو چند لمحوں میں قتل کر ڈالے گا، ڈاکو ایک گھنٹے کے اندر ایک قافلہ کو لوٹ لے گا لیکن سود خوار کا عمل ظلم دائمی، اور انسانی عمروں، خاندانوں، اور نسلوں تک جاری رہتا ہے، وہ جس شکار کو پکڑتا ہے، اس کی مظلومی و بیکسی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے، اور جب تک ہمیشہ کے لیے اس کے تڑپنے لوٹنے اور کراہنے کے نظارہ کا عمل اپنے اندر پیدا نہ کر لے وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔

(افکار آزاد، ص ۱۳۵)

زندگی کی سعادت:

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لینی چاہیے کہ جہاں تک عقل و ماوراء عقل کی نزاع کا تعلق ہے۔ قرآن کے بعد تین دور بحث و نظر کے گذر چکے ہیں۔

☆ ایک دور حکماء و متکلمین اسلام کا جنہوں نے عقلی طریقہ پر مذہبی عقائد کا اثبات کرنا چاہا۔

☆ دوسرا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا۔ جب اسی طرح علم کلام مرتب کیا گیا۔

☆ تیسرا علوم عصریہ کا۔ جس نے بحث و نظر کے تمام گوشوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔

تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے یہاں سیدھے سادے لفظوں میں جو بات کہہ دی ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بلاشبہ بحث و نظر کی کاوشیں دور دور تک گئیں۔ لیکن ہمیشہ ناکامیاب ہوئیں۔ اور ہمیشہ اصحابِ عرفان و تحقیق کو اقرار کرنا پڑا کہ اس سے بہتر اور فیصلہ کن بات اور کوئی نہیں کہی جا سکتی۔

قرآن نے ایمان اور اہلِ ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے۔ اس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ جس قدر یہ کہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون خوف اور غم دونوں سے وہ محفوظ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس سورت کی آیت (۶۲) میں بھی یہی بات فرمائی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا؟

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ خوف اور دکھ۔ جو نہی ان

دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی۔اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں۔سب کو ایک ایک کر کے چنو اور دیکھو۔خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں۔خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت کی۔تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں۔یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔قرآن لکھتا ہے ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے۔جس کے قدم اس راہ میں جم گئے۔اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی!

(افکار آزاد، ص ۷۷۔۱۷۶)

☆☆☆☆☆

حصہ دوم

سیاسیات

آزادی اور مسلمان

انسانی تسلط:

ہم بھی مسلمان ہیں اور ہمارے مذہب نے ہم کو سکھایا ہے کہ حکم کسی طاقت کے لیے نہیں، اور کوئی انسان انسانوں پر محض اپنے تخت و تسلط کے زور سے حکومت کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ ان الحکم الا للہ۔ پس جب کہ ہمارے سامنے یہ شاندار مگر اتنا ہی مؤثر دعویٰ موجود ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں۔ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۵۱)

آزادی، جمہوریت اور اسلام:

تمام دنیا میں جمہوریت کے خیالات پھیل رہے ہیں، شخصی استبداد و مطلق الحکمی سے ہر جگہ نفرت کی جارہی ہے اور اس حقیقت کا اعترافِ پیہم ہے کہ قانونی و سیاسی آزادی میں تمام انسان مساوی الرتبہ ہیں، قوم کو اپنے ثمراتِ ملک سے تمتع کا حق حاصل ہے۔ وہ اس حق میں دوسروں پر مقدم ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اس حقیقت پر ایمان لاچکی ہیں اور ہر ممکن ذریعہ و کوشش سے اس کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ بعض کوششیں ہدفِ مقصود تک پہنچ چکی ہیں اور بعض پہنچنے کے قریب ہیں۔

لیکن مسلمان جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں اب تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور جو باخبر ہیں ان کے تصور میں اس کی صورت مہیب ہے، حالانکہ اس حق طلب اور داد خواہ جماعت میں سب کے آگے مسلمانوں کو ہونا چاہیے تھا، کیونکہ ان کا پیغمبر دنیا میں صرف اسی لیے آیا تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ (مقالات آزاد ص ۱۸۳)

مسلمان اور ہندوستان کی تقدیر:

جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں۔ وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر

رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۳۲۳)

مذہب اور سیاست:

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا، ماقدراللہ حق قدرہ، ورنہ پولٹیکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتداء کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے، جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، بدر الحسن ص ۱۷)

مسلمان اور جہاد فی سبیل الحریت:

یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی، اور داخل جہاد فی سبیل اللہ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے، اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے، جو حق اور صداقت اور انسانی بندِ استبداد وغلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے، آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کررہے ہیں، یقین کیجیے وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لیے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔ پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اٹھانا چاہتا ہے، اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں، بیدار ہوں، اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں، ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، ص ۲۴)

صرف ایک قوت:

دنیا میں ہر انسان کے لیے بے شمار حاکم اور بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں، لیکن مومن کے لیے صرف ایک ہی ہے۔ (دعوت عمل، میرٹھ، ص ۳)

مسلم اور کفر کے خصائص:

خدا نے انھیں (مسلمانوں کو) فضیلت دی ہے اور "مسلم" بنایا ہے۔ کیا بد بختی ہے کہ انھوں نے اپنے اندر کفر کے خصائص پیدا کر لیے ہیں؟ غلامی کفر کا زیور ہے نہ کہ اسلام کا۔ اسلام ایک دین حریت ہے، جو انسان کو آزادی اور شرفِ انسانی کے تحفظ کی دعوت دیتا ہے اور جو کبھی غلامی اور استبداد کے ساتھ جمع ہو نہیں سکتا۔ قرآن ہم کو بتلاتا ہے کہ جو دل مسلم ہو، وہ غلام اور بزدل نہیں ہو سکتا۔ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۸۳)

پیروانِ اسلام کا حصہ:

اگر میرا بس چلتا تو میں اس دنیا کے تمام ماتموں کو صرف مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص کر دیتا اور کسی دوسرے کی شرکت اس میں کبھی گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ زمین پر جہاں کہیں بھی ہمدردی کے آنسوؤں اور دل کے پیام محبت کی ضرورت ہو، وہ صرف پیروان اسلام ہی کا حصہ ہے، اور صرف کلمۂ توحید ہی کے گھرانے کا ورثہ ہے۔ کیونکہ سب اس لیے آئے تاکہ اپنے تئیں بچائیں مگر مسلمان صرف اس لیے آئے تاکہ تمام انسانوں کو بچائیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ سوم، ص ۵۸)

اسلام اور زمین کی وراثت:

اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں حفاظت اسلام کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں۔ جب تک انھوں نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال و اعتقادات میں اُس سے منہ نہیں موڑا۔ اسوقت تک وہ بھی اُن کے ساتھ رہا۔ لیکن جب انھوں نے اپنی صلاحیت و قابلیت کھو دی اور اس مقصد کو بھول گئے جس کی انجام دہی کے لیے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی، تو ان کا دور کار فرمائی ختم ہو گیا۔ اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی امانت کسی دوسری ج'عت کے سپرد کر دی۔ وہ اپنے کلمۂ مقدس کی حفاظت کے لیے ہمارا محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اپنی زندگی کے لیے اس کے دین مبین کی خدمت گذاری کے محتاج ہیں۔ (مقالاتِ آزاد، صفحہ ۸۳۔۸۲)

قوم کی زندگی کی بنیاد:

جو قوم خود اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو، اس کو محض دستوری تحفظات نہیں بچا سکتے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے قانون تمھیں محفوظ نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے آپ اپنے پاؤں کی نسوں کو مضبوط کرو.....

مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ ہے۔ اگر نو کروڑ کے بجائے مسلمان نو لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دلوں میں یہ خیال ہو تا کہ وہ مرنے کے لیے نہیں زندہ رہنے کے لیے ہیں تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔ میری جگہ کمزوری اور تذبذب کی نہیں ہے بلکہ یقین اور ایمان کی ہے۔ تم نو کروڑ ہوتے ہوئے یہ خیال کرتے ہو کہ فنا ہو جاؤ گے، مٹ جاؤ گے، تو اس کا کیا علاج؟ نو کروڑ لاشوں کو کوئی تحفظ اور کوئی دستور نہیں بچا سکتا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ انگریز بہادر بچا سکتا ہے تو وہ بھی نہیں بچا سکتا اور اگر نہیں تو جب وہ اپنا بوریا بستر باندھے جیسے کہ اب باندھ چکا ہے تو اس کو کوٹ سے پکڑنا اور روک لینا۔

دنیا میں صرف تعداد ہی نہیں بلکہ دوسری چیزیں بھی کام آتی ہیں:- میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے، میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لیے صرف ایک فرض رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولھا دہک رہا ہے، اس میں لکڑیاں ڈال دو۔ میں کوئی ایسا سوال اٹھانا نہیں چاہتا جس سے تیسری طاقت کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ دنیا میں وہی بچتا ہے جس کے پاؤں کی نسیں مضبوط ہوں۔

گر گرفتہ ز عشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتست کہ از ما شنیدۂ

(تقریر اجلاس جمعیت علمائے ہند، مارچ ۱۹۴۲، لاہور)

اسلام کا مشن:

دنیا میں صداقت کے لیے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا اسلام کا قدرتی مشن ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، ص ۱۳)

مسلمانوں کا مذہبی فرض۔ حق گوئی:

دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے تراجم (Biography) تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں۔

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراونی چیز نہیں ہو سکتا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔ (قول فیصل، صفحہ ۵۶)

قومی شرف واحترام کے احساس سے محرومی:

افسوس کہ آج دنیا میں وہ قومیں بھی بستی ہیں، جن کے پاؤں میں غیروں کی غلامی کی بوجھل بیڑیاں پڑی ہیں۔ اور ان کی اطاعت اور تعبد کی ذلت کا طوق گلے میں ہے۔ لیکن ان کا حسِ ملی مر چکا ہے اور قومی شرف واحترام کے جذبے سے محروم ہو گئی ہیں۔ پھر وہ اپنی حالت پر قانع ہیں۔ حالانکہ ان کا خدا پسند نہیں کرتا، کہ وہ اس کے بخشے ہوئے فطری حق عزت کو بھول کر غلامی کی ذلت پر قناعت کرلیں۔ کیونکہ اُس نے انسانوں کو صرف اپنی غلامی کے لیے بنایا ہے۔ انسانوں کی غلامی کے لیے نہیں۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۹۸)

مسلمان اور حریت کی بخشش وطلب:

اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی کے حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی، اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اسی میں یقین کرتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور یورپ خود اسی اصول پر کاربند ہو کر آزاد ہو چکا ہے۔ ہم انگلستان سے آج اسی شے کے طالب ہیں، جس چیز کے لیے وہ خود کل تک بیقرار تھا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۳۰۔۲۹)

خدا کی غیرت:

مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی

ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائیگی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں؟ خدا ان کو سر بلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت (والغیرۃ من شان حضرۃ الربوبیۃ) اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد / ۲، بدر الحسن، ص ۲۵)

مسلمان اور خوف و بزدلی:

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف وہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا:

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا لا خوف علیھم ولا یحزنون ط (جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم)۔ ہوائیں آتی اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی۔ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۲۔۲۲۱)

بغاوت اور حب الوطنی:

کیا "بغاوت" آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اس کا نام قابل احترام

حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ (قول فیصل، صفحہ ۷۷)

پولیٹکل جدو جہد اور طاقت:

دنیا میں صرف طاقت ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ قوموں کی پولیٹکل جدو جہد اور حقوق طلبی کی زندگی میں تو طاقت کے سوااور کوئی سوال ہے ہی نہیں۔ اعتماد اپنے اوپر چاہیے، نہ کہ دوسروں پر؟ ایک کاہل اور سست آدمی جو باوجود طاقت کے کھڑا ہونا نہیں چاہتا، کیوں نہ وہ راہگیروں کی ٹھوکروں سے پامال ہو؟ ہم نے درختوں کو چولھے میں جلتے، اور سرسبز شاخوں سے سایہ کرتے، دونوں حالتوں میں دیکھا ہے، جو درخت خود اپنی جگہ پر کھڑا نہ ہو سکا، آرے کے نیچے رکھ کر پھر چولھے ہی میں ڈالا گیا، مگر جو اپنی جڑوں کی مضبوطی کے بل پر اکڑا رہا، اس کو سرسبزی وشادابی کی زندگی نصیب ہوئی۔ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، صفحہ ۶۲۔۶۱)

رشتہ بغاوت وحب الوطنی:

ایرلینڈ کے پارنل (Parnel) نے ایک مرتبہ کہا تھا" تمہارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے"۔

(قول فیصل، ص۷۷)

آزادانہ زندگی:

اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے۔ مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کرے، وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص۸۰)

حقیقت کا قانون اور عدالت کی حیلہ جوئی:

حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا کہ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کر سکا! (قول فیصل، ص۳۶)

انسان کی خود غرضی:

انسانی خود غرضی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان خود اپنے لیے جس چیز کو جائز نہیں رکھتا، دوسرے کے لیے اُسی کا خواہشمند ہوتا

ہے ؟ انگلستان کی سرزمین انصاف و حقوق کا مامن سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بسنے والوں نے صدیوں کی جد و جہد سے اپنے حقوق حاصل کیے ہیں اور حکومتوں کو شکستیں دی ہیں۔ پس ہم بھی آج انگلستان سے وہی چاہتے ہیں جو خود اس نے چاہا (چیرز) پھر اس کے فرزندوں کا یہ نمونہ کیسا وحشیانہ ہے کہ وہ انصاف کے نام سے چڑتے اور حاکمانہ جبر کی پوجا کرتے ہیں ؟

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۵۴)

آزادی کا بیج اور ظلم کا پانی:

"آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو"۔

(قول فیصل، ص ۴۲)

پیدائشی حق:

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ (قول فیصل، ص ۴۸)

حق طلبی اور اس کا انجام:

ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہمارا جذبہ آزادی و حق طلبی سچا اور اٹل ثابت ہوا، تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے، کل کو فتح مند محب الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہو گی! (قول فیصل، ص ۷۷)

جنگ ــــ فیصلے کے آخری دن تک:

"اگر تم صرف چند گھڑیوں کے لیے گورنمنٹ کو حیران کرنا چاہتے ہو' تو اسکے لیے میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اگر خدانہ خواستہ میں اس گورنمنٹ کا استحکام چاہتا، تو وہ نسخے بتلا دیتا........ (لیکن) میں تو ایسی جنگ چاہتا ہوں (جو) ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جائے، بلکہ فیصلہ کے آخری دن تک (جاری رہے) اور جب فیصلہ کی گھڑی آجائے، تو پھر یا تو یہ گورنمنٹ باقی نہ رہے، یا تیس کروڑ (انسان) باقی نہ رہیں"۔ (قول فیصل، صفحہ ۷۴)

ظلم کی عدم تلافی اور وفاداری کی توقع:

میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے، جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو اور مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو۔ ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہو سکتی۔ (قول فیصل، ص ۴۴)

میرا اعتقاد:

میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟

اس کے وجوہ و دلائل اب اسقدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ملٹن کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس" محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

(قول فیصل، ص ۴۹۔۴۸)

جابرانہ حکومت کا وجود اور حق کی قربانی:

اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لیے حق کی قربانی ناگزیر ہے اور اسے ہونا ہی چاہیے۔ تعداد کی قلت و کثرت یا سامان و وسائل کا فقدان اس پر موثر نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم کا صاحبِ شوکت و عظمت ہونا اس کے لیے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت ہی کر لی جائے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ظلم ہے اور حق اور صداقت ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ چہارم، صفحہ ۹۴)

حاکمانہ اقتدار اور اس کی فطرت:

اس اعتقاد سے کس انسان کو انکار ہو سکتا ہے، تجربے اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کوآپریشن کر کے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے اور نہ کسی کو یہ متاع بطور عطیے کے ملی ہے۔ یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے کہ اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے؟ (خطباتِ ابوالکلام آزاد، ص ۲۷۶

محکومی کا عیش اور حریت کی پر محن زندگی:

اس امر کی مثال کے لیے کہ ایک قوم اگر اپنی ملت و وطن کی حفاظت کے لیے مستعد ہو جائے، اگر اپنی غلامی کی حالت کا اس کو سچا احساس ہو۔ اگر وہ محکومی کے عیش پر حریت کی پر محن زندگی کو ترجیح دے تو پھر دنیا میں کوئی ایسی مشکل نہیں جو اس کی راہ جہاد میں حائل ہو سکے۔ اور کوئی کام نہیں جو اس کے لیے ناممکن ہو۔ ایک جابر اور فاتح قوم اپنے محکوموں سے

ہتھیار چھین سکتی ہے۔ پر یہ طاقت تو کسی میں نہیں ہے کہ وہ قوموں سے ان کے دلوں کو بھی چھین لے اور پھر قومی زندگی تیز اور چمکیلے ہتھیاروں ہی کے دم سے نہیں ہے۔ اصلی شے تو دل کی زندگی ہے۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۱۰۴)

تشدد اور قومی بیداری:

جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلے میں نمایاں ہو تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی۔
(قول فیصل، ص ۴۲)

شخصی استیلا و جبر — مسلمانوں کا نصب العین:

اسلام خدا کی بخشی ہوئی انسانی آزادی کو قائم کرنے والا اور ہر شخصی استیلا و جبر کا مخالف ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو جائز آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر وقت حرکت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایک جمہوریت اور مساوات کی روح ہے اور اس حکومت کو خدا کی مرضی کے مطابق نہیں سمجھتا جو پارلیمنٹری اور جمہوری نہ ہو۔ یہ مقصد مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں سے نہیں بلکہ قرآن سے سیکھ کر اپنا نصب العین بنانا چاہیے اور جمود کی جگہ حرکت، آہستگی کی جگہ تیزی، بزدلی کی جگہ ہمت اور گورنمنٹ پر اعتماد کی جگہ خدا اور اس کے بخشے ہوئے دل پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ (الہلال کلکتہ، ج ۱، ش ۸، ص ۹)

بیوروکریسی اور غیر منتخب حکومت:

شخصی اقتدار:

اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے، جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے، اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے، اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں، اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ،

معیار فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے۔ اور سب سے بڑا وہی ہے، جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔

(قول فیصل، ص ۵۰)

شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے:

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔

(قول فیصل، ۴۹۔۴۸)

مسلمانوں کی غیر منتخب حکومت اور اجنبی بیوروکریسی:

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں، جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے؟ اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو، یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو، تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اس کو ظلم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔ اسلام کے علمائے حق نے ہمیشہ جابر مسلمان بادشاہوں کے خلاف ایسا ہی اعلان و مطالبہ کیا ہے۔

(قول فیصل، ص ۵۲۔۵۱)

نامنصفانہ نظام اور اس کا خلاصہ:

ایک مدت تک ہمارا طرز عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی۔ لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو گئے ہیں، گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ اپنے علم و یقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجۂ یقین تک آچکی ہے۔ اس میں نہ تو مزید اضافہ ہو سکتا ہے نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ برابر ہوتا رہے گا جب تک ہم اسے خود بدل نہ دیں گے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے جن کی تبدیلی حالات پر موثر ہو ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے

جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نا منصفانہ ہے اور اگر اس وقت تک قائم رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچا دیے ہیں۔ پس جب کہ ناانصافی اس کا عمل نہیں ہے بلکہ خاصہ ہے تو ہمیں نہ تو متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے۔ (خطبات ابوالکلام آزاد،، ادبستان، لاہور، ص ۲۴۸)

برائی کی تقسیم:

برائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے، لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے۔ یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے۔ یا بری ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "زیادہ بری چوری" اور "کم بری چوری" لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ "اچھی چوری" اور "بری چوری"؟ پس میں بیوروکریسی کی اچھائی اور جائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہ ایک ناجائز عمل ہے۔ البتہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنی خلقی برائی ہی پر قانع رہتی۔ جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بے شمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے، تو پھر کیونکر اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ظلم کا اعلان نہ کیا جائے؟ (قول فیصل، ص ۵۰)

قومی ترقی کی بنیاد:

یاد رکھو، محض فکری وسائل سے تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کو حاصل نہیں کر سکتے، بنیادی چیز جس کو تم نے اپنی غفلتوں اور گمراہیوں کی نذر کر دیا ہے، عمل اور عمل اجتماعی ہے، جب تک اس پر استوار اور مضبوطی کے ساتھ قائم نہیں ہوتے تم کو اس وقت تک کھویا ہوا وقار اور چھنی ہوئی دولت واپس نہیں مل سکتی، فکری وسائل کو محض دماغ کے اندرونی حصہ کا رنگ و روغن سمجھو۔ یہ باہر کا رنگ و روغن نہیں ہے، باہر کی دیواریں جب ہی رنگین ہوں گی، جب عمل کا رنگ و روغن ابھر آئے۔ اور عمل میں جب ہی رنگ و روغن پیدا ہو گا، جب جڑ اور بنیاد مضبوط رکھو گے۔ تم کسی درخت کو ہرا ابھرا اور سبز و شاداب رکھنے کے لیے شاخوں اور پتوں پر پانی ڈالو گے تو درخت ہرگز سرسبز نہ ہو گا البتہ اگر تم جڑ میں پانی دو گے تو تمام

درخت سبز و شاداب رہے گا لہٰذا اگر تم اپنے وقار اور چھنی ہوئی دولت کی واپسی کے کھوج میں ہو۔ اگر تم موجودہ پستی سے دوبارہ بام رفعت پر پہنچنا چاہتے ہو تو جڑ بنیاد، اور اصل کی شادابی کی فکر کرو، یعنی اپنی نمازوں پر استوار ہو جاؤ، اور اجتماعی شکل میں زکوٰۃ کی تنظیم و تقسیم پر عامل، کہ یہی دونوں عمل اصل اور بنیاد ہیں، اور انہیں پر قائم و عامل ہونے پر کھوئی ہوئی دولت کی واپسی کا مدار وانحصار ہے۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۹۶۔۹۵)

سرچشمہ ٔحیات قومی:

قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو ہزاروں افراد کے ذریعے نہیں، بلکہ ہمیشہ سرچشمہ ٔحیات ایک یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ وعدیدہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے، مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت میں جب ایک عمدہ بیج بارآور ہو کر سر اٹھاتا ہے تو اس سے صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں اور ان میں ہزارہا تر و تازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد / بدرالحسن صفحہ ۳۶۳)

قومیت اور انصاف:

مذہب اور قومیت کے معاملے میں انسان کبھی حق وانصاف کے حدود کے اندر نہیں رہ سکتا!

(تبرکات آزاد، ص۲۱۱)

انصاف کا وطن اور قومیت:

انصاف مغرب و مشرق کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے نہ کوئی قومیت، اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف بااثر اور عالمگیر انسانیت ہے۔

(خطبات آزاد، صفحہ ۲۵۲)

قومیت نہیں فوق القومیت :

آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق القومیت کی طالب ہے۔ بہ ظاہر عصر حاضر میں تنگ نظری کے لیے مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اقوام عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے، جب کہ ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطہ نظر کے حامل ہو جائیں۔ (پٹنہ یونیورسٹی میں تقریر، دسمبر ۱۹۴۷ء)

عالمی اتحاد کا تصور اور قومیت:

یہ بات بڑی عجیب و غریب ہے کہ وہ قومیت جو استبداد و ملوکیت کے خلاف ایک محاذ کی حیثیت رکھتی تھی آج خود اس پر جارحیت کا خول چڑھ چکا ہے۔ انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی۔ آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اعتماد کے باوجود جب تک ہم قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہیں ہوں گے۔ انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۱۲)

قوموں کی عزت:

قوموں کی زندگی اپنے نامورانِ ابطال کی عزت و یاد سے وابستہ ہے۔
(ابوالکلام آزاد / ۲، بدرالحسن، صفحہ ۳۶۵)

قوموں کی زندگی:

قومی زندگی کی مثال بالکل افراد و اشخاص کی سی ہے۔ بچپنے سے لیکر عہد شباب تک کا زمانہ ترقی و نشو و نما و عیش و نشاط کا دور ہوتا ہے۔ ہر چیز بڑھتی ہے، اور ہر قوت میں افزائش ہوتی ہے۔ جو دن آتا ہے، طاقت و توانائی کا ایک نیا پیام لاتا ہے۔ طبیعت جوش و امنگ کے نشے میں ہر وقت مخمور رہتی ہے، اور اس سرخوشی و سرور میں جس طرف نظر اٹھتی ہے، فرحت و انبساط کا ایک بہشت زار سامنے آجاتا ہے۔

لیکن بڑھاپے کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، پہلے جو چیزیں بڑھتی تھیں اب روز بروز گھٹنے لگتی ہیں۔ جن قوتوں میں ہر روز افزائش ہوتی تھی، اب روز بروز اضمحلال ہوتا ہے۔ طاقت جواب دیدیتی ہے، اور عیش و مسرت کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ جو دن آتا ہے، موت و فنا کا ایک نیا پیغام لاتا ہے۔ اور جو دن گزرتا ہے، حسرت و آرزو کی ایک یاد چھوڑ جاتا ہے۔

قوموں کی زندگی کا بھی یہی حال ہے، ایک قوم پیدا ہوتی ہے، بچپنے کا عہد بے فکری کاٹ کر جوانی کی طاقت آزمائیوں میں قدم رکھتی ہے۔ یہ وقت کاروبار زندگی کا اصلی دور اور قومی صحت و تندرستی کا عہد نشاط ہوتا ہے۔ جہاں جاتی ہے اوج اقبال اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جس طرف قدم اٹھاتی ہے دنیا اس کے استقبال کے لیے دوڑتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو

زمانہ آتا ہے، اس کو "پیری وصد عیب" کا زمانہ سمجھیے کہ قوتیں ختم ہونے لگتی ہیں، اور چراغ میں تیل کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے اخلاقی وتمدنی عوارض روز بروز پیدا ہونے لگتے ہیں، جمعیت واتحاد کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اجتماعی قوتوں کا اضمحلال نظام ملت کو ضعیف وکمزور کر دیتا ہے۔ وہی زمانہ جو کل تک اس کی جوانی کی طاقت کے آگے دم بخود تھا، آج اس کے بستر پیری کے ضعف ونقاہت کو دیکھتا ہے، تو ذلت وحقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔

شاید ہماری جوانی کا عہد ختم ہو چکا، اب "صد عیب" پیری کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ ہمارا بچپن جس قدر حیرت انگیز اور جوانی کی طاقتیں جس درجہ زلزلہ انگیز تھیں، دیکھتے ہیں تو بڑھاپے کے ضعف ونقاہت کو بھی اتنا ہی تیز پاتے ہیں۔ شاید اس کے بعد اب منزل فنا در پیش ہے۔ چراغ تیل سے خالی ہوتا جاتا ہے، اور چولھا خاکستر سے بھرتا جاتا ہے۔ گذشتہ باتوں کی صرف ایک یادگار رہ گئی ہے، اور جوانی کے افسانے خواب وخیال معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں مٹنا ہی ہے تو مٹنے میں دیر کیوں ہے؟ صبح فنا آگئی ہے تو شمع سحر کو بجھ ہی جانا چاہیے۔ جس بزم اقبال وعظمت میں اب ہمارے لیے جگہ نہیں رہی، بہتر ہے کہ اوروں کے لیے اسے خالی کر دیں۔ ہم نے ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک دنیا میں زندگی کے اچھے برے دن کاٹے، اور ہر طرح کی لذتیں چکھ لیں۔ حکمرانی کے تخت پر بھی رہے، اور محکومی کی خاک پر بھی لوٹے۔ علم کی سرپرستی بھی کی، اور جہل کی رفاقت میں بھی رہے۔ جب عیش وعشرت کی بزم آرائیوں میں تھے تو اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اور اب حسرت وآرزو کے غمکدے میں ہیں، تو اس میں بھی ایک شان یکتائی رکھتے ہیں۔ زمانہ نے ہمارے مٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اب دیر نہ کرے۔ لیکن گو ہم مٹ جائیں گے مگر ہمارے بٹھائے ہوئے نقشوں کا مٹانا آسان نہ ہوگا۔ تاریخ ہم کو کبھی نہ بھلا سکے گی، اور ہمارا افسانہ عبرت ہمیشہ مسافرانِ عالم کو یاد آ آ کر خون کے آنسو رلائے گا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ دوم) ص ۱۳)

قوموں کی معنوی قوت:

ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا، جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ

اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شئے قوموں کی معنوی قوت ہے۔ جو اس کے اخلاق اس کے کیر کٹر اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیۃ الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۱۸)

تباہی کا پیش خیمہ اور قدرت الٰہی کا تنبیہ:

قوموں کے عروج و اقبال کا یہ دور ہمیشہ دنیا میں یکساں رہا ہے اور یکساں ہی نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں۔ مدتوں کی غفلت اور عطالت کے بعد جوش اور مستعدی کی روح پیدا ہوتی ہے اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر ان کو زمین پر ممتاز بنا دیتی ہے لیکن پھر کامیابی کا گھمنڈ فتحیابیوں کا غرور اور عزت و شوکت کی بے فکری کے جراثیم مہلکہ ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اپنی قوت و طاقت پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ جوش و مستعدی کی جگہ قناعت اور عطالت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر محنت و جانفشانی کی جگہ عیش و نشاط اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حالت زوال کا پیش خیمہ ہوتی ہے مگر پھر بھی قدرت الٰہی تنبیہ اور اعتبار کی فرصتیں دیتی ہے۔ اور بیداری کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ خوش بخت قومیں اس سے عبرت پکڑ کے سنبھل جاتی ہیں پر بد بختوں کے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۱۰۰)

آستین صداقت کے سانپ:

کوئی قوم جوش ملت پرستی کے خواہ کیسے ہی دورِ فداکاری میں ہو۔ مگر توراتِ مقدس کی روایتوں میں کہا گیا ہے کہ باغ عدن میں آدم کے ساتھ سانپ بھی تھا۔ بس قوم فروشوں اور خائنین ملت سے خالی نہیں ہوتی۔ اور اس کی آستینِ صداقت میں کوئی نہ کوئی سانپ بھی موجود ہوتا ہے۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۱۱۱)

قومیت اور وطنیت:

قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ لیکن یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ ایک سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد فرنٹیر بک ڈپو، ص ۱۵۸)

جاں نثاری کی زندگی:

یہ جاں نثاری کی زندگی اور قربانی کی بستی ہے۔ یہاں زندگی اسی کے لیے ہے جس کا

دل قربانی کے ہر سوال کا جواب دے اور جس کا ہاتھ بخشش و نثار سے کبھی بھی نہ تھکے۔ حتی کہ لینے والے لیتے لیتے تھک جائیں پر دینے والوں کو لٹنے اور قربان ہونے سے سیری نہ ہو:

سخت جانی تو نہ ہمت ہاریو ہنگام قتل!
دیکھنا ہے، زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۸۴)

جوش کی فطرت:

جوش خواہ کسی قسم کا جوش ہو، لیکن دبانے سے پرورش پاتا، اندر ہی اندر کھولتا اور پھر کبھی نہ کبھی پھوٹتا ہے۔ (مضامین ابوالکلام آزاد حصہ چہارم، صفحہ ۷۵)

امن کا قیام — مقدس نصب العین:

عالمی امن کا قیام اتنا مقدس نصب العین ہے کہ ہم اس کی خاطر عزم و عمل کی ہر وادی قطع کرنے کے لیے بسر و چشم آمادہ ہیں۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۵۸)

اقوام متحدہ کا جلوۂ سراب:

اگرچہ امن وسلامتی کی وہ توقعات جو اقوام متحدہ سے وابستہ ہیں۔ جلوۂ سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن بایں ہمہ یہ جلوۂ سراب بھی ہمیں عزیز ہے اور ہم بسر و چشم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اس سرگشتہ و سراسیمہ دنیا میں کہیں کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے اور کہیں امن و سلامتی کی فضائیں اپنی پوری خوشگواریوں کے ساتھ ہمیں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں تو وہ یونیسکو ہے اور صرف یونیسکو۔

(آزاد کی تقریریں، ص ۸۶-۲۸۵)

فرقہ وارانہ خوں ریزی اور سچائی کی دیوار:

عزیزانِ من! سچائی اور خلوص کے سوا کوئی بھی فولادی دیوار اس خونی طوفان کو نہیں روک سکتی۔ مسلمان کانگریسی ورکرز کو اپنی روایات کے پیشِ نظر ایمان داری، دیانت، خلوص اور سچائی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اگر ہم سچائی کے ساتھ فرقہ وارانہ خوں ریزی کو روکنا چاہیں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ مایوسی کی ضرورت نہیں۔

(میرٹھ کانگریس میں مولانا آزاد کی تقریر، ہفت روزہ پیام، دہلی۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۴۶)

تبدیلی کی خواہش:

ہم کو دنیا کے اندر تبدیلی پیدا ہونے کی خواہش کا کیا حق ہے جب ہم خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے؟ (مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ٦)

کھوٹا سکہ:

مفلس کی جیب کے لیے ایک کھوٹا سکہ بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ پنجم، صفحہ ۲۲)

اتحاد:

جب کبھی انسانوں کے دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی عزت کے لیے باہم مل جاتے ہیں اور اپنے اندر سچا جوش اور محکم ولولہ پیدا کر لیتے ہیں۔ تو پھر ان کی محیر العقول اور مافوق العادت قوتوں کے معجزات وخوارق کا ایسا ہی حال ہوتا ہے۔وفی ذالك فلیتنا فس المتنا فسون وان فی ذالك لایٰتٍ و ما یعقلھا الا العالمون۔

(مقالات آزاد، ص۹۔۱۰۸)

اتحاد:

صرف یہی نہیں کہ اس (اتحاد) کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے، آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹہ کے اندر مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے! (خطبات ابوالکلام آزاد ص۲۹۷)

مجرموں کا کٹہرا:

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونیکی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد وشکر میں ڈوب جاتی ہے، اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور ونشاط کا کیا

عالم ہوتا ہے؟ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ پادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں۔ ان کو اپنی خوابگاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے؟ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے! اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے!

(قول فیصل، ص ۳۵)

فیصلہ لکھنے کا وقت:

یہی گھڑی ہے جو اس کا فیصلہ کرے گی۔ یہی وقت ہے جو ہمیشہ کے لیے ہماری فتح و شکست کا فیصلہ لکھ دے گا۔ آؤ، اپنی قسمت کی تعمیر کریں۔ اپنی عزت و اقبال کو ڈوبنے سے بچالیں۔ اپنی فتح کو شکست کے لیے نہ چھوڑ دیں۔ اسلام کے دامن کے لیے دھبہ نہ بنیں جو کبھی محو نہ ہو۔ ہندوستان کی آزادی اور نجات کی امید تاراج نہ کردیں، جو صدیوں تک واپس نہ مل سکے!

(قول فیصل، صفحہ ۹۲)

برائی درست ہو جائے یا مٹ جائے:

میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟ اس کے وجوہ و دلایل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ملٹن کے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس" محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

(قول فیصل، صفحہ ۴۸)

شکست اور غصہ:

طاقتور آدمی کو شکست کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن جاسکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں!

(قول فیصل، ص ۴۲)

بدترین گناہ:

میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴، الف۔ کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں، اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا۔

اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔ (قول فیصل، صفحہ ۴۷)

میانہ روی کی راہ:

قوموں کی زندگی میں دو عملی کا زمانہ بہت نہایت نازک زمانہ ہوتا ہے۔ اس کوشش میں قوموں نے یا تو افراط کی راہ اختیار کی ہے یا تفریط کی۔ اور یہ دونوں راہیں غلط ہیں۔ فکر و عمل کی طرح زندگی کی راہ تو میانہ روی میں ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جتنی بھی راہیں ہیں، تباہی و بربادی کی راہیں ہیں۔ [صدائے حق (م، مسعود الحسن) ص ۶۷۔۶۶]

غلط توقع:

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ (قول فیصل، صفحہ ۴۸)

یا آزادی یا موت:

لیکن انسانوں کی بد عملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے۔ یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔ (قول فیصل، ص ۶۴۔۶۳)

جیل خانہ:

ہم کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے پاس بڑے بڑے جیل خانے ہیں، لیکن کوئی ایسا جیل خانہ نہیں ہے، جس میں برٹش گورنمنٹ سچائی اور ایمان کو قید کر سکے!

(ذکر آزاد، صفحہ ۱۷۵)

دنیا میں صرف تعداد ہی نہیں، دوسری چیزیں بھی کام آتی ہیں۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۱۵۵)

تنگ نظری ـــ راہِ ترقی کا سنگ گراں:

اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگِ گراں کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے دامن پر اس کے داغ نہ آنے دیں۔ قومی زندگی کی صحت اگر مخدوش

ہوتی ہے تو صرف اسی مرض سے فکر و عمل کے ہر گوشے میں یہ خرابی راہ پا جاتی ہے یہ وبا ایک بہروپیے کی طرح نت نئے بھیس بدلتی رہتی ہے۔ مذہب پر اس کا وار اندھی عقیدت کے روپ میں ہوتا ہے۔ یا راسخ العقیدگی کی شکل میں اس کے گھناونے سائے رینگتے ہیں۔ سیاسیات میں یہ روگ قومیت کا چولہ پہن کر آتا ہے۔ علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کی اقلیم میں یہ خرابی قومیت اور وطنیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے ہمارا اشعار یہ ہونا چاہیے کہ ہم کسی قیمت پر بھی ان جھانسوں میں نہ آئیں۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ تنگ نظری ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ۱۹ اویں صدی کے یورپ میں جس قومیت کے چرچے تھے اس کے تار پود بکھر چکے ہیں اور آج دنیا میں قومیت کی قبا کسی کے جسم پر بھی چست و راست نہیں آتی وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ یہ قیود جلد از جلد اٹھا دی جائیں آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق القومیت کی طالب ہے بظاہر عصر حاضر میں تنگ نظری کے لیے مطلق کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اقوام عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے جب کہ ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل ہو جائیں۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۳۸۔۷ ۲۳)

دوستی اور بے اعتمادی:

یہ عام انسانی تجربہ ہے کہ دوستی کے بطن سے دوستی اور بے اعتمادی کے بطن سے بے اعتمادی جنم لیتی ہے۔ (آزاد کی تقریریں، صفحہ ۳۰۲)

موت کی تلخی اور حیاتِ انسانی:

دنیا میں آدم کی اولاد کو سب سے بڑی تکلیف جو دی جا سکتی ہے، موت ہے۔ اس کے بعد انسانی جبر و تعدی کا اسلحہ بیکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایک قوم خود ہی تلخئ حیات کے اس آخرین جرعہ کو پینے کے لیے تیار ہو جائے، تو پھر دنیا میں کوئی شئے اُس کے لیے ناممکن نہیں وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کچھ کہ دنیا میں حیاتِ انسانی سے ممکن ہے۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۱۰۵)

زندگی اور موت:

زندگی صرف موت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ!

[مضامین ابوالکلام آزاد، (حصہ اول) ص، ۱۲]

ایوان عدالت:

تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لیکر سائنس کے محققین اور ملتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ (قول فیصل، صفحہ ۳۴)

گورنمنٹ کا دعوٰی:

میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتہ کی طرح معصوم ہونے کا دعوٰی رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعوٰی نہیں کیا۔ پھر میں کیوں اُمید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی جو کر رہی ہے، اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلہ میں کیا ہے۔ پس یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے شکوہ وشکایت کا کوئی موقعہ نہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیے۔ (قول فیصل، ص ۳۷)

سی۔ آئی۔ ڈی۔ جہالت اور شرارت کا مرکب:

"سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا کام جہالت اور شرارت دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔" یہ میں نے اس ذاتی علم کی بنا پر کہا جو بے شمار مقدمات کی نسبت مجھے حاصل ہے۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے، انہوں نے اُس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا ہے، کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ہے۔ (قول فیصل، صفحہ ۷۹)

سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے رپورٹر:

انھوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے، اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے، وہ ضرور معصیت ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے۔ وہ محض چند روپیوں کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں، اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں۔ پس میرے دل میں ان کے لیے کوئی رنج اور ملامت نہیں ہے۔ میں اس کام کے لیے انھیں معاف کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے۔

(قول فیصل، صفحہ ۷۹)

سی۔ آئی۔ڈی۔ کا محفوظ ذخیرہ:

میری گرفتاری صریح طور پر انہی واقعات کا نتیجہ ہے، اور اسی لیے دو ہفتہ تک میرے خلاف دفعہ ١٧۔ ترمیم ضابطہ فوجداری ہی کا دعویٰ قائم رہا، لیکن جب اس بارے میں کوئی سہارا نہ ملا تو میرے پریس اور مکان کی تلاشی لی گئی۔ تاکہ میری کوئی تحریر حاصل کر کے بنائے مقدمہ قرار دی جائے۔ جب وہاں سے بھی کوئی مراد ہاتھ نہ آیا، تو مجبوراً سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے محفوظ ذخیرہ کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس شریفانہ کام کے لیے مستعد رہتا ہے اور ضرورت کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ (قول فیصل، ص ۴۳۔۴۲)

انسان کے پیدائشی حقوق:

آزادی تقریر اور آزادی اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ انکی پامالی مشہور فلاسفر مل کی زبان میں "انسانیت کے قتل عام سے کچھ ہی کم" کہی جا سکتی ہے، لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجک کے علانیہ ہو رہی ہے۔ (قول فیصل، صفحہ ۴۰)

اصلاح یا فنا!

جو چیز بری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے، یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جبکہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو! (قول فیصل، صفحہ ۴۸)

سیاست کی غرض:

دنیا کی بادشاہت وسیاست صرف اصلاح کے لیے ہے۔ (الدین والسیاست ص ٦)

زندگی کی خواہش:

ہم طبیعت کے مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابل ملامت ہو، لیکن زندگی کی خواہش قابل ملامت نہیں ہے۔ (قول فیصل، ص ۳٦)

سیاست اور مذہب، سپہ سالار کی تیغ اور فقہا کا فتویٰ:

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتوؤں کا دامن گیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو خواہ کہیں سے

پڑھو، مگر سیکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ جب بادشاہ خوں ریزی پر آتا ہے تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے ہیں۔ صوفیہ اور ارباب وطن پر منحصر نہیں علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بین اسرار حقیقت کے قریب ہوئے۔ فقہاء کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۱۲۵۔۱۲۶)

سیاست، مذہب کی آڑ میں:

ایشیا میں ہمیشہ سے پالی ٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولی ٹیکل تلوار سے ہوئی ہیں، انھیں مذہب ہی کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور ص ۲۲۴)

مجرم:

ہر قوم وملک کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے، جب ملک کا ہر باشندہ ظلم، گھمنڈ اور مادی طاقت کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ (ذکر آزاد، صفحہ ۶۲۔۱۶۱)

شرطِ کامیابی:

ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحادِ عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ!

(خطبات ابوالکلام آزاد، ص ۲۶)

تین راہیں:

ہندوستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں یا موجودہ حالت پر قانع رہے، یا مسلح انقلاب کرے، یا نون کواپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ سچائی ہے اور وہ نون کواپریشن ہے۔ (خطبات ابوالکلام آزاد، ص ۲۹۱)

سیاسی زندگی کی شورشیں اور انجام کار:

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت جمع کروں۔ میں

نامراد ایک طرف متاع فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زان شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام
در نشیب شکن زلف پریشان رفتم

(ترجمان القرآن، ا، صفحہ ۲۵)

تمدنی اصلاحات وسیاست مصطلحہ:

آپ نے لکھا ہے کہ تعطل کا زمانہ کیوں نہ تمدنی اصلاحات کی سعی میں بسر کیا جائے! لیکن زمانۂ تعطل کی قید کیوں؟ یہ کام تو ایسا ہے کہ بڑی بڑی طاقتور کارکن زندگیوں کو وقف ہو جانا چاہیے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح وترقی کہتے ہیں، وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجتمع حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود ہی نہیں اور جس قدر بھی جماعتی مطلوبات ہیں بغیر درستگی علم و عمل بافراد و حصول حقوق معاشرت ومدنیت ممکن نہیں۔

(تبرکات آزاد، ص......)

استقلال کی جنگ اور اسلحہ جنگ:

جنھوں نے اپنی غفلت کی لعنت میں گرفتار ہو کر غیروں کی غلامی و محکومی کا طوق پہن لیا ہے اور ان کی ہیبت وسطوت اور قوائے جنگ واسبابِ تسلط سے مرعوب ہو گئی ہیں۔ انھوں نے گویا ہمیشہ کے لیے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ قوموں کی زندگی اور استقلال صرف قوائے جنگ اور اسلحہ و آلات جنگ کے حصول ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ دلوں کے محکم جوشِ مصیبت کے سچے احساس، مستعدی اور آمادگی کی صداقت اور سب سے زیادہ یہ کہ باہمی نزاعوں اور بے مہریوں کی جگہ اتحاد واتفاق کی زنجیروں میں بندھ کر ایک دل اور ایک جان ہو جانے پر ہے۔ پھر نہ فوج کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ اسبابِ مادیہ مقاومت ودفاع کی احتیاج ہوتی ہے۔ نہ ہتھیاروں کے چھن جانے سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ قلعوں کے مسمار ہو جانے سے قوت سلب ہو سکتی ہے۔ (مقالات آزاد، صفحہ ۱۱۶)

حقیقت کا قانون:

اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے اور "دو اور دو" کو اس لیے 'چار' نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدل جاسکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گذرتی ہے، وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب کہ ان کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا، آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو جاسکتی۔ (قول فیصل، ص ۵۳۔۵۲)

خوف اور قوموں کی حیاتِ معنوی:

ڈر قوموں کی حیاتِ معنوی کیلیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۱۷۔۲۱۶)

قربانی کا جذبہ ناتمام:

تاریخ نے اس بارے میں انسانی ظلم و تعدی کے جو ہیبت ناک مناظر دکھلائے ہیں، ان کے مقابلے میں موجودہ جبر و تشدد کسی طرح بھی زیادہ نہیں کہا جاسکتا، البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کمی اس لیے ہے کہ ابھی ملک کا جذبہ قربانی ناتمام ہے، یا اس لیے ہے کہ ظلم زیادہ مکمل نہیں؟ (قول فیصل، صفحہ ۷۶)

صبر کی راہ کا معجزہ:

سول ڈس او بیڈینس کے لیے ہمیں کسی ایسی ہی بات کی تلاش تھی۔ ہم کب سے اس موقعہ کے انتظار میں راہ تک رہے تھے؟ پھر یہ کیسی مخالفت ہے جو عین موافقت کا کام دے رہی ہے؟ اور کیسا مقابلہ ہے جس کا ہر وار ہمیں ایک نیا ہتھیار بخش دیتا ہے؟ فی الحقیقت یہی ایمان و صبر کی راہ کا معجزہ ہے، اور یہی وہ راز ہے کہ ایمان اور قربانی کے مقابلے میں طاقت کا سارا ساز و سامان بیکار ہو جاتا ہے۔ دنیا میں شکست دینے اور مٹانے کے جتنے بھی ہتھیار ہیں، ان میں سے کوئی ہتھیار بھی اس پر غالب نہیں آسکتا۔ (قول فیصل، صفحہ ۹۵)

جوشِ حیات کی پرورش:

قوموں اور جماعتوں کے حس و غیرت اور جوشِ حیات کی پرورش کے لیے جبر و تشدد مثل اُس پانی کے ہے جو کسی خشک وافسردہ درخت کی جڑ پر ڈالا جائے۔ یہ پانی جس مقدار میں اُسے میسر آتا ہے، ٹھیک اُسی کے مطابق اس کی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۱۷)

آغاز سے پہلے انجام کا اضطراب:

ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے۔ اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۱۹)

آتش کدۂ شعلہ فشاں:

اور قوموں کے لیے اگر سیاست ان کے تمام اعمال کی بنیاد ہے تو اس لیے کہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لیے وہ سیاسی جذبات سے ایک گرم انگیٹھی کا کام لیتے ہیں۔ لیکن جس قوم کے پاس ایک شعلہ فشاں آتش کدہ موجود ہو، اُسے انگیٹھی کی کیا ضرورت ہے؟ جب تنور گرم ہو جاتا ہے تو بہت سی انگیٹھیاں اس سے گرم کر لی جا سکتی ہیں۔ لیکن انگیٹھی تنور کا کام نہیں دے سکتی۔ (افکار آزاد، ص ۶-۱۰۵)

شکست کا خوف:

شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو، اور تلوؤں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے ٹھوکر کھاؤ گے، اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا، اتنی دیر قافلہ اور دور نکل گیا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۵۱)

جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔

(نقش آزاد، صفحہ ۴)

ہستی کی رونق:

اس طلسم سرائے ہستی کی ساری رونق انسان کی غفلت و سرشاری سے ہے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ دوم، ص ۱۰)

ظہور انقلاب:

دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ اس کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں۔ اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے کے حدود و خطوط بھی ہل رہے ہیں، کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے، جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل کے دامن میں کیا ہے۔ تاہم جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل صاف ہی ہے جس کے لیے کسی کہانت کی ضرورت نہیں! (افکارِ آزاد، ص ۹۵۔ ۹۴)

دلوں کا عشق اور روحوں کا ایمان:

جسموں کو مارا اور ہتھیاروں کو چھینا جا سکتا ہے لیکن دلوں کے عشق اور روحوں کے ایمان کے لیے نہ کوئی کاٹ ہے نہ کوئی آگ! (قول فیصل، ص ۹۲)

کام کی کمی اور بگاڑ:

کام کا کم ہونا برا نہیں ہے، مگر کام کا بگاڑ دینا نا قابل معافی ہے۔

(قول فیصل، ۹۸)

طاقت کی فطرت:

طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلل ہے۔ وہ تو خود بھی طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے۔ اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبے کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔ (قول فیصل، ص ۷۶)

عدالت کا اختیار، عدل کا ذریعہ یا ناانصافی کا آلہ:

ہمارے اس دور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد

ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے ہیں، تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے، اور وہ انصاف اور ناانصافی، دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل وحق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔ (قول فیصل، ص ۳۳)

وعدہ خلافی:

گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی۔ اس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲ر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کے اعلان میں کیا تھا، اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ر جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے، لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے۔ (قول فیصل، ص ۶۵)

بنیادی خرابی اور جزوی خوبی:

میرے لیے اس کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں۔ اگر وہ تمام ناانصافیاں ظہور میں نہ آتیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں، جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا۔ کیونکہ اس کی ہستی ہی سب سے بڑی ناانصافی ہے، اور اس کی برائی کے لیے اسقدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ اچھے کام کرے، تو اس کی اچھائی تسلیم کرلی جائے گی، لیکن اس کا وجود ناجائز اور ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر ایک شخص ہماری جائداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے، تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جاسکتا۔ (قول فیصل، ص ۴۹)

طاقت کی نمود اور ناواجب کا اعتراف:

دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دیں گے کہ وہ اس کے حقدار نہیں؟ پھر ایک پورے براعظم کے لیے ایسی امید کیونکر کی جاسکتی ہے؟ طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلل ہے۔ وہ تو خود بھی

طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے، اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبہ کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔ پس کشمکش اور انتظار ناگزیر ہے، اور ایک ایسی قدرتی بات ہے جس کو بالکل دنیا کے معمولی اور روزمرہ کاموں کی طرح بلاکسی تعجب وشکایت کے انجام پانا چاہیے۔ (قول فیصل، ص ۷۶)

قیدیوں کا اختیار اور آزادی:

"رفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیو ٹالسٹائی (Leo Talstoy) کے لفظوں میں کہوں گا "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے، تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔" (قول فیصل، ص ۴۹)

پرائیوٹ زندگی:

جو شخص پیشوائی اور رہنمائی کی زندگی اختیار کرتا ہے، اس کی زندگی کا کوئی حصہ پرائیوٹ نہیں ہو سکتا، اور اگر اس کی زندگی میں کوئی راز ہو، تو وہ پیشوائی کا اہل نہیں، وہ جو کچھ گھر کے اندر کرتا ہے اس سے بھی بحث کرنے کا پبلک کو حق حاصل ہے۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۸۰)

کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت:

کانگریس کی شرکت وعدم شرکت کی نسبت آپ نے عام خیالات کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کا خیال ایسا ہی ہے، لیکن میری بصیرت اس معاملے کو بالکل دوسری ہی صورت میں دیکھتی ہے، اور وہ آپ لوگوں کو ۱۹۱۲ء سے معلوم ہے۔ البتہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ معاملہ اس طرح حل ہوگا، جس طرح آج کل بعض حضرات حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جنھوں نے محض یہ واقعہ دیکھ کر کہ کانگریس پچھلے الیکشن میں کامیاب ہوئی ہے، یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے۔

مسلمانوں کو اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے شریک ہونا چاہیے کہ ادائے فرض کا تقاضا یہی ہے اور اس کی بنیاد خود اعتمادی ہے، نہ کہ کسی طاقت کی خوشامد یا کسی طاقت سے اندیشہ۔

(نوادر ابوالکلام، ص ۱۴-۱۳)

شرائطِ کامیابی:

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کامیابی کے لیے تین شرطیں اٹل ہیں۔ جب تک وہ ان شرطوں کی طرف سے مطمئن نہ ہو جائیں ہرگز ہرگز اس راہ میں قدم نہ اٹھائیں۔ کام کا کم ہونا برا نہیں ہے، مگر کام کا بگاڑ دینا ناقابل معافی ہے۔ اگر اس نازک گھڑی میں ہم نے ذرا بھی غفلت کی، تو ہم سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی مجرم نہ ہو گا۔

پہلی شرط "نظم ہے۔ چاہیے کہ سب سے پہلے اپنی انتظامی قوت کو اچھی طرح دیکھ بھال لے۔ انتظام کیلیے تین باتوں کی طرف سے اطمینان ہونا چاہیے:

(۱) تمام مقامی کارکن کسی ایک شخص کے حکموں پر چلتے ہوں، اور پوری طرح اس کی اطاعت کرتے ہوں۔ اور تمام کارکنوں کو پوری اطاعت کے ساتھ اس کا ساتھ دینا چاہیے۔

(۲) مقامی آبادی پر کمیٹی کا پورا پورا اثر ہونا چاہیے۔ اس کو یقین ہونا چاہیے کہ وہ وقت پر سب کو اپنے قابو میں رکھ سکے گی۔

(۳) انتظام کے قائم رکھنے کے لیے کافی اور ہشیار کارکن ہونے چاہئیں، تاکہ ہر وقت کام دے سکیں۔

دوسری شرط "امن" ہے، اور یقین کرنا چاہیے کہ اگر ہم امن قائم نہ رکھ سکے تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ کام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہم امن کو گورنمنٹ کے لیے نہیں چاہتے۔ خود اپنی کامیابی کے لیے چاہتے ہیں۔ گورنمنٹ تاک میں ہے کہ کوئی بات بھی بلوے اور بد نظمی کی ہو جائے، اور پھر اس کو قابو پانے کا موقعہ مل جائے۔ پس چاہیے کہ ہم سچے دل سے اس شرط پر یقین رکھیں، اور خدمت دین وملت کے پاک کام کو بدمعاشوں اور شریروں کی شرکت سے گندہ نہ ہونے دیں۔ ہم کو پوری ہشیاری اور نگہبانی کے ساتھ اس کا اطمینان کر لینا چاہیے۔

تیسری شرط "استقامت" ہے۔ یعنی قربانی اور جانبازی کی راہ میں قدم اٹھا کر پھر اس طرح جم جانا کہ نہ تو کوئی طمع ہلا سکے، نہ کوئی خوف ڈرا سکے۔ سمندر کی طرح پر جوش، پہاڑ کی طرح مضبوط۔

نزول الجبال الراسیات وقلبهم
علی العهد لا یلوی ولا یتغیر!

اس شرط کے لیے اور زیادہ کیا کہوں؟ کامیابیوں کی جڑ، فتح ومراد کا سرچشمہ، ایمان کا خلاصہ، عمل کی روح، خدا کی رحمت کا وسیلہ اگر ہے تو صرف یہی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون! جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے، تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے، اور نہ کوئی غم۔

(قول فیصل، ص۹۹۔۹۸)

انسانی عقائد کی پرانی سچائی:

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ (قول فیصل، ص ۴۸)

محکومی کا عیش اور حریت کی پر محن زندگی:

اس امر کی مثال کے لیے کہ ایک قوم اگر اپنی ملت و وطن کی حفاظت کے لیے مستعد ہو جائے اگر اپنی غلامی کی حالت کا اس کو سچا احساس ہو۔ اگر وہ محکومی کے عیش پر حریت کی پر محن زندگی کو ترجیح دے تو پھر دنیا میں کوئی ایسی مشکل نہیں جو اس کی راہ جہاد میں حائل ہو سکے۔ اور کوئی کام نہیں جو اس کے لیے ناممکن ہو۔ فی الحقیقت اہلِ قرطاجنہ کی تاریخ ایک سرچشمۂ عبرت و بصیرت ہے۔ ایک جابر اور فاتح قوم اپنے محکوموں سے ہتھیار چھین سکتی ہے۔ پر یہ طاقت تو کسی میں نہیں ہے کہ وہ قوموں سے ان کے دلوں کو بھی چھین لے۔ اور پھر قومی زندگی تیز اور چمکیلے ہتھیاروں ہی کے دم سے نہیں ہے۔ اصلی شے تو دل کی زندگی ہے۔

(مقالات آزاد، صفحہ ۱۰۴)

فتح مندی کی یادگار مثال:

ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وایلنس نون کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خونریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے، لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار

سے نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے، میں اسے فطرۃ الٰہی اور عدل واخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں، اوران دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلنس جدوجہد کے ذریعہ فتح مند ہوگا، اور اس کی فتح مندی اخلاقی وایمانی طاقت کی فتحمندی کی ایک یادگار مثال ہوگی۔

(قول فیصل، ص ۷۰)

طاقت اور برائیوں سے انکار:

کیا صرف اس لیے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے، اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے؟ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی (Maxsini) کی زبان میں کہوں گا "ہم صرف اس لیے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے، تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کرسکتے"۔ (قول فیصل، ص....)

وفاداری سے انکار:

میں یہاں گورنمنٹ کی ان ناانصافیوں کا افسانہ نہیں چھیڑوں گا جو مسئلہ "خلافت" اور مظالم "پنجاب" کا عالمگیر افسانہ ہیں۔ لیکن میں اقرار کروں گا کہ گذشتہ دوسال کے اندر کوئی صبح وشام مجھ پر ایسی نہیں گذری ہے، جس میں میں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے۔ جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کررہی ہو، اور مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو، ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہوسکتی، گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق محارب کی حیثیت رکھتی ہے۔ (قول فیصل، ص....)

صبر اور تشدد کا مقابلہ:

دنیا نے دیکھ لیا کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر وتشدد میں بالکل بے حجاب اور بے لگام ہے، تو ملک میں بھی صبر وبرداشت کی طاقت روز افزوں نشوونما پارہی ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے، آج بھی اس کا موقعہ حاصل ہے کہ انکار کردیا جائے، لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہوگی۔ یہ مستقبل کی رہنمائی کریگی کہ کیونکر اخلاقی

مدافعت مادی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے؟ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعہ خونریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے؟ البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے جو برائی کے مقابلہ میں صبر و عفو کی تعلیم لیکر آیا تھا؟ گورنمنٹ میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیوروکریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

(قول فیصل، ص ۴۱)

قومی بیداری اور جبر و تشدد:

آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے، وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کے لیے خاص طور پر اسے ملامت کی جائے۔ قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبر و تشدد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعت ثانیہ (سکینڈ نیچر) کا حکم رکھتا ہے، اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل دی جائے گی۔

(قول فیصل، ص ۷۶)

زوال کا پیش خیمہ اور قدرت الٰہی کی تنبیہ:

قوموں کے عروج و اقبال کا یہ دور ہمیشہ دنیا میں یکساں رہا ہے اور یکساں ہی نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں۔ مدتوں کی غفلت اور عطالت کے بعد جوش اور مستعدی کی روح پیدا ہوتی ہے اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر اُن کو زمین پر ممتاز بنا دیتی ہے لیکن پھر کامیابی کا گھمنڈ، فتحیابیوں کا غرور اور عزت و شوکت کی بے فکری کے جراثیم مہلکہ ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اپنی قوت و طاقت پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ جوش و مستعدی کی جگہ قناعت اور عطالت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر محنت و جانفشانی کی جگہ عیش و نشاط و فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حالت زوال کا پیش خیمہ ہوتی ہے مگر پھر بھی قدرت الٰہی تنبہ اور اعتبار کی فرصتیں دیتی ہے۔ اور بیداری کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ خوش بخت قومیں اس سے عبرت پکڑ کے سنبھل جاتی ہیں پر بدبختوں کے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (مقالاتِ آزاد، ص ۱۰۰)

تکلیف موت اور آخر میں جرعۂ حیات:

دنیا میں آدم کی اولاد کو سب سے بڑی تکلیف جو دی جا سکتی ہے، موت ہے۔ اس کے

بعد انسانی جبر و تعدی کا اسلحہ بیکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایک قوم خود ہی تلخیٔ حیات کے اس آخرین جرعہ کو پینے کے لیے تیار ہو جائے، تو پھر دنیا میں کوئی شے اُس کے لیے ناممکن نہیں وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کچھ کہ دنیا میں حیاتِ انسانی سے ممکن ہے۔ (مقالات آزاد، ص ۱۰۵)

فاطمہ بنت عبداللہ ایک سعید و صالح روح:

"جنگ خواہ حملے کی ہو خواہ مدافعت کی، ساحلی بیڑے سے توپوں کی بارش ہو رہی ہو، یا تلواروں اور سنگینوں کی، سامنے صفیں ہوں مگر زخمی مسلمان کی آہ میں اس کے لیے ایک ایسی کشش تھی جس کو سن لینے کے بعد محال ہو جاتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی مشک اپنے فرض کو بھول جائے۔ وہ کم سن تھی لیکن اس کے اندر ایک کہن سال عشق موجود تھا۔ یہ عشق لہو ولعب یا تمتعاتِ حیات کا نہ تھا بلکہ خون زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا، جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتیں وہ ایک بادرفتار ہرنی کی مستعدی مگر فرشتۂ عشق کے پروں سے اڑتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی تھی"۔ (مقالاتِ آزاد، ص ۱۷)

آبگینۂ شرف:

قومی شرف و عزت ایک نہایت نازک آبگینہ ہے۔ وہ بہت جلد ٹوٹ جا سکتا ہے اور ہوائے محکومیت کی ذرا سی کثافت بھی اس کو دھبہ لگا دیتی ہے۔ جس قوم کی خود مختاری اور حریت کے شرف پر محکومی کا دھبہ لگ گیا اور وہ اسے نہ دھو سکی تو پھر خواہ بہ ظاہر اس کے ہاتھ پاؤں آزاد ہوں اور اس کے خزانے زر و جواہر سے لبریز نظر آئیں، لیکن کسی سرزمین پر اس کے لیے عزت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے شرف کا آبگینہ ٹوٹ گیا۔

یہ ایک عزت انسانیت کا سر عظیم ہے، جس کو دنیا کی وہ قومیں نہیں سمجھ سکتیں، جنھوں نے اپنا پرانا خوابِ عزت فراموش کر دیا ہے (مقالاتِ آزاد، ص ۹۷)

گورنمنٹ کی تفرقہ اندازپالیسی:

میں اس "جرم" سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جبکہ میں ہندوستان کی اس آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں، جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آرہے ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جرنل "الھلال"

جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا، اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائیگی۔ مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی۔

(قول فیصل، صفحہ ۶۷)

گورنمنٹ اور قتل کا جواز:

جو گورنمنٹ جلیان والا باغ امرتسر میں چند منٹوں کے اندر سیکڑوں انسانوں کو قتل کر ڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔

(قول فیصل، صفحہ ۴۷)

ہدایت وحی اور اس کے پہنچانے والے:

ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت، سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کرلی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا، وہ ان تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعے اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا "رسول" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے۔

☆☆☆

حصہ سوم

فلسفہ علوم و فنون

فلسفہ و علوم و فنون

تاریخ و آثار قدیمہ:

ہمارے ملک کی تاریخ مٹی کی تہوں کے نیچے دبی پڑی ہے۔اور اس وقت کی منتظر ہے جب کوئی ماہر آثار قدیمہ آئے اور اس کے دفینے بر آمد کرے۔ دراصل یہی وہ دفینے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ہمارے ملک کی قدیم تاریخ کا قصر تعمیر ہو سکتا ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۹۵)

آثار قدیمہ اور تہذیب کی دریافت:

ہندوستان میں آثار قدیمہ کی دریافت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس ملک میں قریب قریب دو صدی یوروپی اقتدار رہا۔ اس عرصے میں اس بیرونی طاقت نے یہاں کی صنعت تعمیر اور ان تاریخی یادگاروں کا جائزہ لیا۔ جو اس ملک کی باعث صد افتخار قدیم تہذیب کی آئینہ دار تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس ملک کی تہذیب اتنی قدیم ہے کہ دنیا کے دائرہ علم و تحقیق میں صرف جزوی معلومات آسکتی ہیں۔ یوروپ کے ماہرین آثار قدیمہ نے اس مدت میں مسمار شہروں اور ان کے کھنڈروں میں کچھ ایسے مٹے ہوئے نشانات بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو باعتبار علم و تحقیق جنت نظارہ کا حکم رکھتے ہیں۔ تاریخی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں مشہور مورخین الفنسٹون اور بارنس نے جب افغانستان کے لیے رخت سفر باندھا تو اثنائے راہ میں راولپنڈی کے پشتوں نے ان کے دیدۂ عبرت نگاہ کو دعوتِ نظارہ دی۔ اس سفر میں انہوں نے یونانی سکے بھی دیکھے اس سے وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے کہ جو پشتے ان کی نگاہوں سے گزرے ہیں، ہو سکتا ہے ان میں قدیم شہر ٹیکسلا کے کچھ مٹے ہوئے آثار بھی دستیاب ہو سکیں۔ باوجودیکہ عتیقی آثار کی سراغ رسانی کے سلسلہ میں ترغیبات کچھ کم نہ تھیں۔ لیکن پھر بھی ہندوستان کے کسی حصے میں تحقیقاتی سرگرمیاں شروع نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک سناٹے کا عالم طاری رہا۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۴۷-۲۴۶)

تلاش حقیقت کی دشواری:

تاریخ قیاس وظنون اور شخصی آرا کے پریشان مجموعوں کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلے پر ایک حادثہ گزرتا تو اخباروں کے دونامہ نگار متفق اللسان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالم گیر کے گرد وپیش کن آلات واسباب کا ہجوم تھا۔

(مضامین مولانا ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو۔ لاہور، ص۲۳۱)

تاریخ کی رہنمائی:

دنیا میں سب سے پہلے انسان کے آگے تاریخ یعنی دنیا کے گزرے ہوئے واقعات آتے ہیں اور انہی سے انسان تجربے کی دانائی اور بصیرت حاصل کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہمیشہ ایک ہی طرح کے واقعات ظاہر ہوئے ہیں ایک ہی طرح کے اعلانات کیے گئے۔ ایک ہی طرح کی حالتیں طاری ہوئیں اور ایک ہی طرح کے نتیجے نکلے۔ پس تجربہ اور استقراء اسے بتادیتا ہے کہ اب بھی ہمیشہ جب کبھی ویسی حالتیں پیدا ہوں گی، تو ویسے ہی نتائج نکلیں گے اور اگر آگ کے شعلوں نے ہمیشہ انسان کے جسم کو دکھ دیا ہے تو ایسا کبھی نہ ہوگا کہ آگ کے شعلوں میں کود کر کوئی ٹھنڈک پائے۔

(افسانۂ ہجر ووصال، ص۱۱)

شرائط تاریخ:

تاریخ مشاہدے کا نام نہیں ہے، بلکہ روایت کا، اور پھر قرائن و تجسس، ظنون غالبہ اور بحث و تعلیل کا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، صفحہ ۲۳)

تاریخ کی راہ:

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کی راہ مذہبی عقیدت اور حسن ظن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۱۶)

نادانی کی رفاقت:

فلسفۂ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور عاقبت نااندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی

رفیق ہوتی ہے۔

(قول فیصل، صفحہ ۴۰)

خلافت ـــ مفہوم اور مقصد:

"خلافۃ" عربی کی ایک مصدر ہے۔ اس کا مادہ ہے "خلف"۔ مفردات امام راغب میں ہے" الخلافة ' النيابة عن الغير' اما بالغيبة المنوب عنه، و امالموته، واما لعجزه، واما لتشريف المستخلف" (صفحه ١٥٥)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرع معنی کے لیے اختیار کرلیا۔ جیسے ایمان، غیب، تقدیر، بعث، صلواۃ و غیر ذالک۔ "ایمان کے لغوی معنی یقین و طمانیۃ اور زوال خوف و شک کے تھے، لیکن قرآن حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کے لیے استعمال کیا، اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافۃ اور " استخلاف فی الارض" اور "وراثت وتمکن فی الا رض" سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور اور ضلالت وطغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے، ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانیۃ دنیا میں پھیل جاے، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے ذرات تک نافذ و قائم ہے، اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو کر کرہ ارضی کو سعادت و امنیت کی ایک بہشت زار بنادے!

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۲۔۱)

خلافت راشدہ:

پہلا سلسلۂ خلافت خلفاء راشدین مہدیئین کا تھا جن کی خلافت منہاج نبوت پر

تھی۔ یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعیت شخص رسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق کار ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا، اور اس لیے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزء تھا۔ اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح ان کی شخصیت بھی جامع و حاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر، حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظام شرع، نظام شریعت اور نظام سیاست، یہ تمام قوتیں ان کی ذات واحد میں جمع تھیں۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومت شوریٰ، جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ری پبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔

(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، صفحہ ۶-۵)

تاریخ اسلام کے دو عہد، مکی اور مدنی:

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے:

ایک عہد، مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔

دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔

پہلا آنحضرت صلعم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غار ثور کے انزوا پر۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سر و سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن خود اسلام کی نظروں میں اسکی زندگی کا اصلی دور، دوسرا دور نہیں، پہلا تھا۔

وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں، پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا، لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے، ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں۔ بلاشبہ مکہ کی فتح، عرب کی فیصلہ کن فتح تھی، لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی

راہ کیونکر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو، لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیے۔

پہلا دور تخم تھا، دوسرا اس کے برگ وبار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی، دوسرا ستون ومحراب تھا۔ پہلا نشوونما کا عہد تھا، دوسرا ظہور وانفجار کا۔ پہلا معنی وحقیقت تھا، دوسرا صورت واظہار۔ پہلا روح تھا۔ دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا، درست کیا اور مستعد کر دیا۔ دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھایا اور فتح وتسخیر کا اعلان کر دیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو لیکن اولین بنیاد واستعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہے۔

(رسولِ رحمت، ص ۲۱۱-۲۱۰)

مکّی دور اور اس کی اہمیت:

ظہور اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہو کر ہجرت پر ختم ہوا اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا، دراصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا اور اس لیے ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدا یہی دور تھا، نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہ دنیا کی ظاہر بیں نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور اور بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا، لیکن بباطن امت مسلمہ کی ہر آنے والی فتحمندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشوونما پا رہی تھی۔ یہی مصیبتیں تھیں جو "جماعت" کے ذہن واخلاق کے لیے تعلیم وتربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس وارواح کی امتحان گاہ تھیں۔ بدر کے فتح منداسی کے اندر سبق لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور ڈھل رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدائش بھی اسی کی آزمائشوں اور خود فروشیوں میں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد کو تو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحہ جنگ سے کرنا پڑا تھا، لیکن نفس واخلاق کے تزکیہ وتربیت کا جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اسے "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا کیونکہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی جہاد تھا: فلا تطع الكافرين وجاهدهم به جهاداً كبيراً (فرقان :۵۳) (سو منکروں کی بات نہ مان اور ان سے جہاد کر اس کے (قرآن) کے ساتھ بڑا جہاد)۔

بالاتفاق سورہ فرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم دیا گیا تھا، ظاہر

ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا، صبر واستقامت اور عزم وثبات کا جہاد تھا اور انھی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہا تھا، اس لیے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری تکمیل تھا۔ صحابۂ کرام اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے۔
(رسول رحمت، ص ۲۱۵)

حقیقتِ فتحِ مدینہ:

یہ حقیقت کسی درجہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتح مندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہوئی تھی۔ مدینہ کے ساتھ "فتح" کا لفظ سن کر تعجب ہوا ہوگا کیونکہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بھی بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور روحوں کی اقلیموں کی فتح ہے اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ عین اس وقت جب کہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہو گیا تھا، باشندگان یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہو کر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے۔ اس وقت دنیوی جاہ وجلال کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ سیف وسنان کی ہیبت وجبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سرتاسر غربت اولیٰ کی بے سروسامانیاں اور عہد مصائب ومحن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق واطاعت کی ایسی خود فروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو جاتی ہے جو تاریخ عالم کی کسی بڑے سے بڑے فاتح اور شہنشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی۔

دلوں اور روحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھ کر بھی اور کوئی فتح ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ فتح کیونکر ہوئی؟ دور ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔
(رسول رحمت، ص ۲۱۶)

عالمی امن کا نصب العین اور تعلیم کی قدریں:

گزشتہ تیس سال سے میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ جب تک ہم تاریخ وجغرافیہ کی تعلیمی

قدریں نہیں تبدیل کریں گے ۔ دنیا میں عالمی امن کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ آج کل اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم کا جو انداز ہے اس سے اختلافات ونزاعات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخ بالعموم قومی مفاخر کی داستان ہے اور کہیں کہیں اس میں کسی قوم کے حالات بڑھا چڑھا کر بیان کیے جاتے ہیں۔ رہا جغرافیہ کا معاملہ، اس میں عالمی وحدت کی بنیادیں استوار نہیں ہوتیں بلکہ اس کے برعکس اختلافات اور نزاعات کے سوت پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہم صرف اس کی حد بندیوں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنی جانب سے کچھ اور حدود قائم کردیتے ہیں۔ ہر ملک نقشہ میں جہاں کہیں دکھایا گیا ہے اس پر نیا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں ہمارے بچوں کے ذہن میں اختلافات کا بیج پڑ جاتا ہے۔ جب تک بچوں کی تعلیم وتربیت کا انداز نہیں بدلے گا اور ان کے ذہن میں یہ بات نہیں بٹھائی جائے گی کہ وہ عالمی وحدت اور آفاقی شہریت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم بین الاقوامی سطح پر مفاہمت کی خوش گوار وخوش آئند فضا کیسے پیدا کرسکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یونیسکو نہ صرف ایک ایسی تاریخ تہذیب وتمدن کی تربیت کا بیڑا اٹھا رہا ہے، جس کا مرکز وحدت انسانی کا تخیل ہوگا بلکہ اس کے پیش نظر تاریخ وجغرافیہ کی تعلیمات پر نظر ثانی کا مسئلہ بھی ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۷-۴۰۶)

وحدت انسانی اور تعلیم:

بعض اوقات مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مرد وزن کتنے خوش قسمت تھے جو بائبل کی روایات پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ اور جن کا یہ پکا عقیدہ تھا کہ نسلوں اور قوموں کے مابین خواہ کتنے ہی اختلافات سہی ۔ ہم آدم وحوا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ مشترکہ ولدیت کا یہ تخیل، اختلافات ونزاعات کے باوجود نقطہ وصل اور مرکز اتصال کا حکم رکھتا تھا۔ انیسویں صدی میں جیسے جیسے ہمارے علم میں اضافہ ہوا ہم ان مذہبی روایات میں مین میکھ نکالنے لگے۔ مشترکہ ولدیت کے باوجود ہم نے اپنے آپ کو کبھی کاکیشائی اور منگولیائی کہا اور کبھی آریائی اور سامی، اور بھی تقسیمیں کی گئیں۔ یہ تو میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آدم وحوا کی جو داستان مشہور ہے وہ لفظاً لفظاً صحیح ہے یا کلدیانی توہمات کا عبرانی چربہ ہے۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک اس داستان کی روح یا اس کے نفسِ مضمون کا تعلق ہے اس کی صداقت میں شبہ

نہیں کیا جا سکتا۔ یہ داستان اس اساسی حقیقت کا اعتراف ہے کہ بنی آدم باعتبار تخلیق ایک جوہر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کائنات کے تمام افراد ایک دوسرے کا گوشت پوست ہیں۔ میرے خیال میں یہ اعتراف حقیقت نظریہ ارتقاء کے عقیدہ سے میل نہیں کھاتا اور نہ اس سے کوئی مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اتحادِ اصل و نسل کی نفی نہیں ہوتی۔ اختلافات کے سلسلے میں یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ان کا سرچشمہ ماحول اور اس کے اثرات ہیں۔ غرض جس طرح عالمی وحدت کے استحکام کے لیے جغرافیہ کی تعلیم میں تجدید و تغیر کی ضرورت ہے، اسی طرح وحدتِ انسانی کے قیام و بقا کی خاطر تاریخ کی تعلیم کا انداز ہ بھی نئے قالب میں ڈھلنا چاہیے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۹۱-۲۹۰)

تعلیم اور انسان دوستی:

ایسی فضا کی تخلیق میں جہاں انسان دوستی اور برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے چولی دامن نظر آئیں تعلیم اور صرف تعلیم کی معجز نمائیوں کو دخل ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۸۶)

صوبائی زبانیں اور ذریعہ تعلیم:

تاریخ اس طرز تعلیم کے لیے کوئی وجہ جواز پیش کرنے سے قاصر ہے جس کی طرح میکالے نے ڈالی تھی۔ میکالے کی یہ دلیل کہ سنسکرت اور فارسی کو ذریعہ تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا، غلط نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حجت لغو ہے کہ ذریعہ تعلیم صرف انگریزی زبان ہو سکتی ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف صوبائی زبانیں اپنے اندر اتنی وسعت اور جامعیت نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں اعلیٰ پیمانے پر ذریعہ تعلیم قرار دیا جاسکے، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر کوئی قومی حکومت انہیں ترقی دینا چاہتی تو اس کے امکانات تھے ضرور۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۲۹-۲۲۸)

سرکاری تعلیم اور قومی خصائص:

ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو

پہنچائے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے، علم، خدا کی ایک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے۔ لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلواتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو، علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔

(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۵۲۔۱۵۱)

سائنس:

سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔ اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کی تسکین اُس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا، مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں، تو کس کی طرف اٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں ؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند!

(غبار خاطر، صفحہ ۶۳)

حدودِ فن:

اخبار نویسی ایک عمدہ اور ضروری کام ہے لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہر اخبار نویس قضا و افتا کا کام بھی شروع کر دے۔ یہ کام ان لوگوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، جن کا یہ کام ہے اور جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(جامع الشواہد، صفحہ ۱۶۰)

نوائے بلبل:

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے۔ جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر زمستان کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ

فروشیوں کے ساتھ باغ وصحرا پر چھا جاتی ہے، تو اُس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہو گئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر ابلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضا کا ایک ایک ذرہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان وزمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگائیے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے، سونگھیے تو سرتاسر بو کی عطر بیزی ہے۔

صبا بہ تہنیت پیر مئے فروش آمد	که موسم طرب وعیش ونائے ونوش آمد

ہوا مسیح نفس گشت وبا دنافہ کشا	درخت سبز شد ومُرغ در خروش آمد

تنور لالہ چناں برفروخت باد بہار	کہ غنچہ غرق عرق گشت وگل بہ جوش آمد

عین جوش وسرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اُس وقت انسانی احساسات میں یہ تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف وصوت سے ان کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہو گا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا، تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ، بو، اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھے گا۔ پھر کود پڑے گا، اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا۔

بیا تا گل بر افشانیم وے در ساغر اندازیم!
فلک راسقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
چو دردست ست رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم وپا کو باں سر اندازیم!

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے فیضی کو کہنا پڑا تھا۔

هزار قافلہ شوق می کشد شب گیر
کہ بار عیش کشاید بخطہ کشمیر

لیکن افسوس ہے، لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا۔ عالم بہار کی جنت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائیں گے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں۔ بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں۔ معلوم نہیں دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہو گئی ہے؟ حالانکہ انسان کو معدہ کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا۔ (غبار خاطر، ص ۵۱۔۲۴۹)

نغمہ و شعر:

موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں، اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزاء کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزاء کو حسن ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے:

تو حنا بستی و من معنی رنگین بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں، وہی موسیقی میں الحان وایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا۔ اس نے اپنی روح معنی کے لیے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا۔

والا ذن تعشق قبل العین احیانا!

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شیلے کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ (Words worth) کی حقائق سرائیاں:

دریں میدان پرنیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی وصد کشور تماشائی !

(غبار خاطر، صفحہ ۳۱۵)

مطالبۂ حسن:

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے، اور حسن

اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اُس محروم ازلی پر، جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینہ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر!

(غبار خاطر، صفحہ ۳۰۷)

جمال:

جس چیز کو ہم جمال کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب! یہی موزونیت اور تناسب ہے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے۔

(ترجمان القرآن، حصہ اول، ص ۱۴۳)

حسن اور فن:

اصحاب نظر کا قول ہے کہ حسن اور فن کے معاملہ میں حب الوطنی کے جذبے کو دخل نہیں دینا چاہیے:

(غبار خاطر، صفحہ ۲۰۰)

عشق اور انسان:

عشق خواہ کسی عنوان ہو، منزل حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے کہ جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۲۱۷)

عام اور دل پسند تماشا:

عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے، جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے اور جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۲۲۸)

عشق کی آمد:

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو، مگر مجنوں

ضرور ہوتا ہے۔ اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کرو۔
(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص ۲۲۰)

حسن اور آن:

ایک چیز خوبصورتی ہے، اور ایک چیز اس سے بھی بڑھ کر ہے، جس کے لیے زبان کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن آنکھ سمجھتی اور ذوق پہچان لیتا ہے۔ خواجہ حافظ نے اس کو ''آن'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آن باش کہ ''آنے'' دارد

اور پھر جب بالکل مجبور ہوگئے تو اشارہ کر کے چھوڑ دیا:

ایں کہ می گویند ''آں بہتر ز حسن''
یارِ ما ''ایں'' دارد و ''آں'' نیز ہم

تو وہ جو ایک چیز ہے کہ ''آنے دارد'' اس کے لیے کسی کا صرف خوبصورت ہونا ہی کافی نہیں، خوبصورت تو ہزاروں ہوتے ہیں، مگر ''آن'' رکھنے والے چشم وابرو لاکھوں خوبانِ روزگار میں ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ اور اگر مل جائیں، تو سمجھنا چاہیے کہ فطرت کی بڑی ہی فیاضی بلکہ غیر متوقع اسراف ہے۔ (تذکرہ، صفحہ ۶۳۔۱۶۲)

محبت کا اصل مقام:

محبت کا اصل مقام وہ ہے جہاں پہنچ کر نفس اپنے کو فنا کر دیتا ہے۔
(صدائے حق، صفحہ ۲۹)

عشق کی گرفتاری:

عشق کی بری سے بری گرفتاری بھی بے دردی و بے سوزی کی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس راہ کی ناکامی بھی کم از فتح و فیروزمندی نہیں:

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل ست

(تذکرہ صفحہ ۳۲۰)

عالم عشق کی سیر:

بیابان نوردی عالم عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے مجنوں جو صفِ عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے، کہ صحراگردی میں کوئی اس کا حریف نہیں!

(مضامین ابوالکلام آزاد، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور، ص۲۲۱)

عشق کی کار فرمائی اور نگاہ حقیقت ناآشنا:

اور یہاں عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے، نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے، عشق ہی ہے۔ تمام کائنات ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے؛ زمین کا مدار و محور قائم ہے، تو اسی کے دم سے۔ دنیا میں جس قدر ظاہر ہے، یہی ہے؛ جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہِ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں، جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقتِ یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں، ورنہ:

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری ، انجمنے ساختہ اند

(تذکرہ، صفحہ ۳۱۸)

محبت کی کوتاہی:

محبت کی کوتاہیاں حد تلافی و مکافات سے مافوق ہیں۔ ہر کوتاہی کی تلافی ہو سکتی ہے، لیکن محبت کی کوتاہی کی تلافی ممکن نہیں۔

(تبرکات آزاد، ص۱۵)

فلسفہ و حکمت۔ یقین و اثبات اور وہم و خیال:

زمانے کی حالت دوسری ہے۔ لوگ اپنے سائے سے بھڑکتے ہیں اور ایمان کے لیے اگرچہ یقین و اثبات کے طالب ہیں، مگر ڈرنے کے لیے وہم و خیال کو کافی سمجھتے ہیں۔

(تبرکات، آزاد صفحہ ۳۹۔۱۳۸)

جستجو اور منزل:

محض جستجو کے ارادے سے منزل نہیں مل سکتی، آپ سرخی اور چونا مہیا بھی کرلیں پھر بھی مکان نہیں بن سکتا جب تک کہ معمار نہ ہوں۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ اول، ص ۱۵)

انسانی ارادے ـــــ عالم بیداری کا خواب:

انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔

(الہلال کلکتہ، ج ا، ش ا، ص ا)

بناؤ بگاڑ:

سوچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے، دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی، اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اٹھایا۔ دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھلنا پسند نہیں آیا تھا اُسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھلے گا تو اسکے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی۔

عیش ایں باغ بہ اندازہ یک تنگ دل ست
کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید!

غور کیجیے تو یہاں ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔

بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی!

(غبار خاطر، صفحہ ۲۹۳)

اخلاقی ذمہ داری:

خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے

ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں:

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!

(غبار خاطر، صفحہ ۱۰۵)

سر و سامان حیات:

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کر لے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اُسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے، اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام
زیں ہوسہا بگزر یا نہ گزر، می گزر، می گزرد!

(غبار خاطر، صفحہ ۱۰۱)

حقائق ہستی کی روح معنی:

اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے، تو حقائق ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ معمہ ٔ ہستی کے بیجان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کر لیں۔

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے، تو پھر جو کچھ بھی ہے، روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں۔

(غبار خاطر، صفحہ ۴۸-۱۴۷)

راہِ مقصد کی خاک:

راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے

سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی:

خاکِ کویش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نہ گزاشت در سیمائے من !

(غبار خاطر، صفحہ ۷۳)

پانے کا مزہ:

یہاں پانے کا مزہ انھی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں انھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ نظیریؔ کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی:

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ، یافت
تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود

(غبارِ خاطر، صفحہ ۷۲)

کامرانی اور سود وزیاں کی کاوش:

یہاں کامرانی سود وزیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود وزیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تردامنی کی گرانی محسوس کیجیے، نہ خشک دامنی کی سبک سری، نہ آلودہ دامنی پر پریشاں حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سر گرانی:

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل وقعر دریا آتش ست (عرفیؔ)

(غبار خاطر، ص ۳۶)

طبیعت کی افسردگی:

طبیعت افسردہ ہوتی ہے تو الفاظ بھی افسردہ نکلتے ہیں۔ میں طبعیت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں۔ آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا۔

ایں کہ در جام وسبو دارم مہیا آتش ست

آپ اس طریق کار پر متعجب نہ ہوں۔ آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے فیضیؔ کو بھی یہی طریقہ کام میں لانا پڑا تھا۔ نل دمن میں اُس نے ہمیں خبر دی ہے:

تا تازہ گو ترزنم رقم را
در بادہ کشیدہ ام قلم را

(غبار خاطر، ص ۱۴۱۔۱۴۰)

عالم احساس:

انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹے گی؟ گزرنے کے بعد سوچیے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا! (غبار خاطر، ص ۳۱)

چمن زار نہاں خانۂ دل:

یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ و فی انفسکم افلا تبصرون؟ (غبار خاطر، ص ۹۸)

کوتاہ دستی و محرومی:

اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ ہمیشہ انھی کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شادؔ عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

(غبار خاطر، ص ۲۶۳)

اسلام اور قانون جذب و انجذاب:

اسلام کو اپنی صداقت و حقیقت کی طاقت پر پورا بھروسا ہے اور قانون الٰہی یہ ہے کہ

ہر قوی ضعیف کو اپنی طرف کھینچتا اور ہر طاقت کمزور پر چھا جاتی ہے۔ قوت میں فاعلیت ہے اور کمزوری میں انفعال اور قوت و ضعف میں اعتبار کیفیت کا ہے نہ کہ مجرد کمیت کا۔

اسی قانون جذب و انجذاب اور فعل و انفعال پر کارخانۂ وجود ہستی کے تمام حوادث و اعمال کا دار و مدار ہے اور یہ قانون مادہ و جسم کی طرح تمام معقولات و معنویات میں بھی ٹھیک ٹھیک جاری و ساری ہے۔

پس اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ قوت ہے، طاقت ہے، اصلح ہے، امثل ہے۔ اس لیے جب کبھی اسلام اور غیر اسلام میں قرب ہو گا تو اسلام اپنے ماسوا کو کھینچے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام کو غیر اسلام اپنے میں جذب کر لے۔ اگر ایسا ہو تو قانون الٰہی باطل ہو جائے اور اگر یہ قانون باطل ہو تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

(جامع الشواہد صفحہ ۷۳۔۷۲)

فطرت کا افادہ و فیضان:

فطرت کے افادہ و فیضان کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالم گیر حسن و جمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے۔ کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اسکا کوئی رخ نہیں جس پر حسن و رعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈال دی ہو۔

(ترجمان القرآن، ا، صفحہ ۱۰۲)

اصل بجز خوبی کچھ نہیں:

برائی محض ایک اضافی شئے ہے، اصل بجز خوبی اور اچھائی کے کچھ نہیں۔ اعتبار ہر حال میں ثمرات و نتائج کا ہے، نہ کہ ظواہر و اوائل کا۔ کتنے ہی راہ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ اور کتنے ہی قدم ہیں کہ ٹھوکر نہ لگے، تو ان میں تیزی و چالاکی بھی نہ آئے، اور راہ کے نشیب و فراز سے ہمیشہ غافل رہیں۔ کتنے ہی کفر ہیں، جو وسیلۂ ایمان ہوئے! کتنے ہی ایمان ہیں، جن کا خاتمہ کفر پر ہوا!

(تذکرہ، صفحہ ۲۲۷)

سفر کی کامیابی اور نامرادی:

سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے، نہ مختلف راہوں پر۔ راہ کوئی ہو، قدم میں حرکت اور ہمت میں اقدام ہے، تو کبھی نہ کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ خواہ راہ میں ہر درخت کے سائے تلے دم لو، خواہ ہر سرائے میں کمر کھولو۔ لیکن ساری نامرادی و بے حاصلی اس کے لیے ہے جس کے لیے راہ و منازل کے تماشے اس طرح دامن گیر ہوگئے کہ وہیں ہمیشہ کے لیے بستر جمادیا:

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے! کوئی درمیانی منزل ہو! اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے، تو پھر وہی منزل بت ہے اور رہرو اس کا پرستار، تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔ من شغلک عن اللہ فھو صنمک۔ کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے کہ:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

اور نامرادی نہیں ہے، مگر اٹکنے اور رہ جانے میں:

یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(تذکرہ، صفحہ ۲۲۔۳۲۱)

قطع علائق کی راہیں:

انسان کی محبوبات و مالوفات کے اٹکاؤ ایک نہیں بیشمار ہیں۔ اُس کی گردن میں الفتوں کی طوق کا بوجھ ہے۔ اُس کے پاؤں علائق کی زنجیروں سے گراں بار، اُس کا دل چاروں طرف سے صدہا قسم کی کششوں کا نشانہ، ہر زنجیر کے بند ھن پر مرنا اور ہر علاقہ کی الفت میں اسیر رہنا چاہتا ہے، تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستشِ ماسوی اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا کوئی طاقتور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے، جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی

حلقہ شماری کی انتظاری۔ ایک سوکھی لکڑی کے جلانے کے لیے ہزاروں تدبیریں کیجیے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لیے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے:

گفتم چگونہ می کشی وزندہ می کنی؟

از یک نگاہ کشت ،جوابے دگر نہ داد

قطع علائق اور دفعِ موانع کی جتنی راہیں سعی وہمت اور طلب و جستجو سے پیدا کی جاتی ہیں، سب پہلی صورت میں داخل ہیں۔ اور دوسری صورت جذب و عشق کی ہے۔ یہ قوت فرشتۂ عشق کے سوا اور کسی کے ہاتھ میں نہیں کہ ہزاروں نشتروں کا کام ایک ہی وار میں پورا کر دے:

دمِ شمشیر بود رہگزرِ عشق،ولے

ہر کہ ایں رہ نہ رود، پے بہ درِ دل نہ برد

اسی لیے عرفائے طریق نے کہا: عشق کی بری سے بری گرفتاری بھی بیدردی و بے سوزی کی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے، اور اس راہ کی ناکامی بھی کم از فتح وفیروزمندی نہیں:

رہ رواں را خستگیٔ راہ نیست

عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست

(تذکرہ، صفحہ ۲۰۔۳۱۹)

مفاسد کے دواعی وترغیبات:

علماء غیر علماء سے نفس معلومات میں ممتاز ہیں، عمل میں نہیں۔ مفاسد کے دواعی وترغیبات جس طرح عوام کے لیے قہر وتسلط رکھتی ہیں، ان کے لیے بھی۔ اسی لیے باوجود علم وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔" (تبرکات آزاد، صفحہ ۱۰۳)

اصول یا مقاصد:

اصول مقاصد کے لیے ہیں، مقاصد اصول کے لیے نہیں ہیں۔

(مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب، صفحہ ی)

الم کدۂ حیات اور انسانی شکایتیں:

اس الم کدۂ حیات میں ہر لمحہ جو گذرتا ہے، نہیں معلوم کتنی زندگیوں کے آلام

و مصائب کی داستانیں اس میں ختم ہو جاتی ہیں اور کتنی شروع ہوتی ہیں۔ کارخانہ عالم کی محنت پسندی کا یہی قانون ہے اور انسانی شکایتوں کی اسے پروا نہیں۔ (الہلال، کلکتہ، ج۱، ش۱، ص ۲)

انسان کی کمزوری۔ توقعات کی زندگی:

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ خود بخود ایک بے وجہ توقع قائم کرلے، پھر ناکامی کی شکایت میں عمر بسر کردیتا ہے۔ حالانکہ یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی کو سکون و طمانیت کے ساتھ کٹنا چاہیے اور اس کے لیے کیا امر مانع ہے کہ الم و مصائب ہی ہمیشہ پیش نہ آئیں؟ تیرنے والے دریا میں رہ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ مگر دریا سے ڈرنے والوں کو کشتی کے اندر بھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔

مصائب حیات زندگی کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی ختم بھی ہوں گے۔ بس کام کرنے والوں کو ان پر ماتم کرنے کی جگہ، کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی دائمی رفاقت کو گوارا بنا لیں اور دریا سے نکلنے کی سعیِ بے سود کی جگہ تیرنے کی کوشش کریں، ورنہ ساری عمر ہاتھ پاؤں مارنے میں ختم ہو جائے گی اور کنارے تک رسائی نصیب نہ ہوگی:

ہزار رخنہ بدام و مرا ز سادہ دلی
تمام عمر او اندیشۂ رہائی رفت!

(الہلال کلکتہ، ج۱، ش۱، ص ۳)

سب سے بڑا کام:

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی۔ یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے۔ اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کرلی، اُس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق
گفتم اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں!

(غبار خاطر، صفحہ ۱۰۴)

خوش رہنا:

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی، کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں:

چو مہمانِ خرا باتی بعشرت باش بارنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں گر ایں مستی خمار آرد

(غبار خاطر، صفحہ ۱۰۴)

آئینہ خانۂ حیات:

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ جہاں پر چہرے کا عکس بیک وقت سیکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی، محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غم ناک چہرے اکٹھے ہو جائیں۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عرفؔی نے اپنے شاعرانہ پیرائے میں ادا کیا ہے:

بہ دیدار تو دل شاد ند باہم دوستان تو
تراہم شاد ماں خواہم چو روے دوستان بینی

(غبار خاطر، لاہور، صفحہ ۱۰۵)

تبدیلی و تغیر:

یکسانی، اگرچہ سکون و راحت کی ہو، یکسانی ہوئی، اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب

سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے، اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں "حمضوا مجالسکم" اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو۔ سو یہاں زندگی کا مزہ بھی اُنہی کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں، اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا، جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے؟ خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
آخر جیئے گا کب تلک اے خضر؟ مر کہیں!

(غبار خاطر، صفحہ ۷۲)

مقصد کی زندگی:

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
سرمد بہ مئے و پیالہ ربطے دارد

(غبار خاطر، صفحہ ۷۰)

سکون واضطراب:

ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے۔ آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست
ما زندہ از انیم کہ آرام نہ گیریم! (کلیم کاشانی)

(غبار خاطر، صفحہ ۴۵)

انسان کی انفرادیت کی نمود:

یہ بات بھی یادرکھنی چاہیے کہ انسان کی تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف طرح کی نوعیتیں رکھتی ہے۔ کبھی وہ سوتی رہتی ہے، کبھی جاگ اٹھتی ہے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے،اور پھر کبھی زور شور سے اچھلنے لگتی ہے۔انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشوونما کی محتاج ہوئی۔ جس طرح ہر انسان کا ذہن وادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا،اسی طرح انفرادیت کا جوش بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں ابلتا۔مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں،شاعروں،مصوروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سروں میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اتنی پرجوش ہوتی ہے، کہ جب کبھی بولے گی، سارا گردوپیش گونج اٹھے گا:

یک بار نالہ کردہ ام ازدردِ اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدامی تواں شنید!

اسی لیے ایک عرب شاعر کو کہنا پڑا تھا:

وماالدھر الا من رواۃ قصائدی
اذا قلتُ شعراً،اصبح الدھر منشداً

(غبار خاطر، ص۲۶-۲۲۵)

حقیقت سے انکار:

حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص عزت حاصل نہیں کر سکتا۔

(خطبات جمعات وعیدین، ص ۷۳)

ترک واختیار:

وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو؟

توؤ قطعِ مناز لہا، من و یک لغزش پاے (بیدلؔ)

اور پھر اگر غور وفکر کا ایک قدم اور آگے بڑھایئے تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جاکر ختم ہو جائے گا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اُسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
زز ہد ہم چو توئی یا بفسق ہم چو منی! حافظؔ

اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانی عمل کا معیار کیا ہوا اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں، تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفائے طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش (حالیؔ)

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقش عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھایئے کہ آلودگیاں دامن تر کریں مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے۔ کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی:

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (دردؔ)

(غبار خاطر، ص۳۹۔۳۸)

سب سے بڑی معصیت:

یہاں سب سے بڑی معصیت اپنے وجود کا احساس اور اثبات ہے۔

(صدائے حق، ص۲۹)

عمل کی علت:

تمہارے عمل کے لیے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تمہارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔

(ذکر آزاد، صفحہ ۱۵۷)

حوادثِ عالم اور اس کے تماشائی:

حوادث عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوئی ہے۔ وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی ہے۔

(خطبات ابوالکلام آزاد، لاہور، ص۲۵۵)

فکری وسائل:

محض فکری وسائل سے تم اپنے کھوئے ہوئے وقار اور دولت کو حاصل نہیں کر سکتے۔

(خطبات جمعات وعیدین، ص ۷۶)

بزم وانجمن کی پرستش نہانی:

بزم وصحبت کی ادب آموزیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک ایک گھونٹ کی لذت لے کر جام خالی کیجیے، تو مے پرستوں کی سیہ مستیاں چاہتی ہیں کہ کسی گوشے میں چھپ کر پوری صراحی منہ سے لگا لیجیے۔ بزم وانجمن کی پرستش نہانی و دزدیدہ نگاہی بھی ایک لطف ہے اور خلوت و تنہائی کے راز و نیاز کا بھی ایک عالم ہے۔

(تذکرہ، ص ۳۳۴)

طاقت کے وعدے اور انصاف:

طاقت کے وعدے اگر بزور شمشیر فتح کر لیے جائیں تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے، لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

(خطبات آزاد، دہلی، ص ۱۶۵)

حفظ وضبط کے آداب کی مشکلات:

شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ وضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ بر آ ہونا مشکل ہے۔

(تذکرہ، ص ۳۲۳)

سب سے پہلا اور بہتر رفیق:

آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لیے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے، اس سے طبیعت نہایت درجے مسرور ہوئی۔ کاش! اس کا جلد ظہور ہو۔ ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہو گا۔ سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۰۵)

موجب تاسف:

انسان کا اپنا فرض نہ ادا کرنا ہمیشہ اس کے لیے موجبِ تاسف و تألم ہوتا ہے۔

(تبرکات آزاد، ص ۱۲۰)

اسبق و اوّل:

اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں۔ یہ اٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد (غبار خاطر، ص ۲۶۳)

مطمئن اور خوش حال زندگی کے شرائط:

خدا کی حکمت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیے یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد، لیکن خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ تمہاری زندگی میں تین چیزیں پیدا ہو جائیں، جن تین چیزوں کے بغیر تم ایک مطمئن اور خوشحال زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

(۱) سکون (۲) مودت (۳) رحمت

تسکنو االیھا و جعل بینکم مودۃ و رحمۃ۔

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

مودت سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے۔ شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے اس لیے رشتہ جوڑتی ہے تاکہ ان کی ملی جلی زندگی کی ساری تاریکیاں محبت کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

لیکن محبت کا یہ رشتہ پایدار نہیں ہو سکتا۔ اگر رحمت کا سورج دلوں پر نہ چمکے۔ رحمت سے مقصود یہ ہے کہ شوہر اور بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں بلکہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دینے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے لیے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دے دیتا

ہے۔ ایک خود غرض محبت کرنے والا صرف اپنی ہی ہستی کو اپنے سامنے رکھتا ہے، لیکن رحیمانہ محبت کرنے والا اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور دوسرے کی ہستی کو مقدم رکھتا ہے۔ رحمت ہمیشہ اس سے تقاضا کرے گی کہ دوسری کمزوریوں پر رحم کرے، غلطیاں اور خطائیں بخش دے۔ غصہ، غضب اور انتقام کی پرچھائیں بھی اپنے دل پر نہ پڑنے دے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۷۷۔۱۷۶)

مفاسد کی بستیاں اور عہد کے مصلح کا فرض:

کاش امت کے مفاسد کی عمارتیں صرف زمینوں اور آبادیوں ہی میں بنی ہوتیں اور انھیں ڈھاکر ہم فارغ البال ہو جاتے، لیکن انھوں نے تو دلوں اور روحوں میں اپنی بستیاں بسالی ہیں اور جب تک وہ نہیں اجڑتیں۔ اینٹ اور چونے کی دیواریں گراکر ہم کیا بنالیں گے؟ یہ صرف ایک جماعت یا کسی محدود آبادی کی اصلاح کا معاملہ نہیں ہے، ایک پوری امت کی اصلاح درپیش ہے جو کروڑوں افراد سے مرکب ہے اور صدیوں سے مفاسد کے توارث وتعامل اور کاربار علم ودعوت کی برہمی نے قلب ماہیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہاں نہ صرف ایک ہی گوشے کے علم سے کام چل سکتا ہے، نہ صرف ایک ہی پہلو کا انہماک صحیح ہو سکتا ہے۔ وقت کے مفتی کے لیے اتنا کافی ہے کہ جواز وعدم جواز اور وجوب وعدم وجوب کے احکام کا عالم ہو، کیونکہ اسے صرف فتویٰ لکھنا ہے لیکن عہد کے مصلح ومقوم کے لیے صرف اتنا ہی کام نہیں ہے اسے لکھنا نہیں بلکہ نافذ وقائم کرنا ہے۔ اسے علم احکام سے کہیں زیادہ حکمتِ اعمال کے بھیدوں اور نکتوں کا محرم راز ہونا چاہیے۔ وذالك من علم النبوة۔

ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداریست
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاریست

گزشتہ قرنوں میں کتنی ہی اصلاح طلب قوتیں صرف اس لیے ضائع گئیں کہ طریق عمل کی حکمت ترتیب کار کا قاعدہ "الاقدم فالاقدم" کی اصل عظیم اور رعایتِ احوال وظروف کی اہمیت نظر انداز کر دی گئی اور یہ افسانہ طول طویل ہے:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

(تبرکات آزاد، صفحہ ۷۰۔۲۶۹)

انسان کا گھمنڈ:

انسان کا گھمنڈ دور کی فتح مندیاں دیکھ لیتا ہے، لیکن قریب کی بدبختی اسے نظر نہیں آتی۔
(تبرکات آزاد، صفحہ ۲۸۹)

ناقابل تغیر:

وقت کے تقاضوں سے بعض باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن جن چیزوں کی بنیاد ایک ٹھوس عقیدے اور حقیقت پر ہو، وہ نہیں بدلتے۔
(آزاد کی تقریریں، صفحہ ۸۴، ۱۸۳)

شرط کامیابی:

زندگی کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کر لیا جائے اور اپنے اشغال واعمال کو محض حوادث وواقعات کے حوالے نہ کر دیا جائے۔
(ابوالکلام آزاد، آثار وافکار، ص.....)

تحسین کا مستحق:

ہر طاقت ور ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لیے ہے، جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کر لے۔
(نقوش ابوالکلام آزاد، صفحہ ۸۰)

انسان اور درندہ:

انسان یقیناً انسان ہے۔ پر وہ درندہ بن جائے تو درندوں سے بھی بدتر ہے۔
(مقالات آزاد، صفحہ ۱۱۰)

بنیاد کا ٹیڑھ:

آپ کہتے ہیں کہ مسجد کا منارہ سیدھا نہیں، میں روتا ہوں کہ بنیاد ٹیڑھی ہے۔
(نقوش ابوالکلام آزاد، ص۷۹)

استقامت:

چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے، مگر ان کے جوش استقامت

کامقابلہ کرنا آسان نہیں۔

(غبار خاطر: صفحہ ۲۵۸)

دو سفر:

سفر دو ہیں۔ایک اشخاص کا،ایک مقصد کا۔اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کیے جائیں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لیے قربان کر دیں۔جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔اب ان کے لیے سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اسکے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں،ایک ہی ہیں۔

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہست وہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے، جو بیج بوتا ہے۔خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروانِ مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔ومن آیاتہ یریکم البرق خوفاً و طمعاًوینزل من السمآء مآءً فیحیی به الارض بعد موتها ان فی ذالك لایات لقوم یعقلون۔(اور دیکھو اس کی قدرت و حکمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے۔بلاشبہ اس صورت حال میں ان انسانوں کے لیے جو دانش و بینش رکھتے ہیں، حکمت الٰہی کی بڑی ہی نشانیاں ہیں۔(روم) (تبرکات آزاد، صفحہ ۸۹۔ ۳۸۴)

مصلحت اور اس کے حدود:

مصلحت وقت کے متعلق آپ کا خیال صحیح ہے، مگر آپ کا یہ جملہ صحیح نہیں کہ اسلام میں مصلحتِ وقت کوئی چیز نہیں، حالانکہ سنت اللہ مصلحت ورعایت وقت کی مقتضی

ہے۔ اسلام کیونکر اصلاً اس سے تخلف کر سکتا ہے؟

دنیا کے ہر فکر، ہر عمل اور ہر سعی کو دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمیشہ ایک چیز وہ ہوتی ہے جس کو "مقصد" کہتے ہیں اور ایک چیز وہ جو اس مقصد کو عمل میں لائے اور اس کے وسائل وذرائع سے عبارت ہے۔

رہا یہ امر کہ اس دائرے میں بھی مصلحت وقت کے حدود کیا ہیں؟ اور کہاں تک ہمارے عمل کو اس قانون سے متاثر ہونا چاہیے؟ تو اس کے لیے بھی قرآن وسنت نے نمونے پیش کر دیے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ مصلحت وقت کا قانون اپنی انتہائی حالتوں میں بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا کہ حفظ واعلان مقصد کے ساتھ مقدار وطرز عمل کی سرعت وآہستگی، یا تقدیم وتاخیر یا زیادہ سے زیادہ بعض حالتوں میں سکوت والتوابس۔ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں۔ اس سے قدم ایک انچ بھی بڑھا تو پھر حدود نفاق وکفر شروع ہو گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مصلحت کی بنا پر کسی حقیقت سے انکار کر دیا جائے یا مصلحۃً حق کی جگہ باطل کی دعوت دی جائے۔

(تبرکات آزاد، صفحہ ۳۰۔۲۸)

طمانیتِ قلب اور ذوق وحال:

میں زندگی بھر کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق وحال کے میسر نہیں آتا ومن لم یذق،لم یدر

(تبرکات آزاد، صفحہ ۱۷۹)

شامِ وصال وصبحِ وداع:

دنیا کسی کے لیے کبھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن اگر تم خود بدل جاؤ تو اس کو بھی یک قلم بدلا ہوا پاؤ گے۔ تمہاری دنیا تمہارے میکدۂ شباب میں ایسی تو نہ تھی جیسی اب بڑھاپے کی پامالیوں میں نظر آرہی ہے؟ شامِ وصال میں تمہاری یہی ہر روز والی دنیا جو رعنائیاں رکھتی تھی، صبح وداع کی اداسیوں میں کب باقی رہیں؟

گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں ہے اب! (تذکرہ صفحہ ۳۲۶)

جوش اور غصہ:

مصیبت یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جوش اور غصہ کا باہمی فرق بہت ہی خفیف رہا ہے۔

ہر دم آزردگی غیر سبب راچہ علاج؟
ماگز شتیم زلطف تو غضب راچہ علاج؟

(افکار آزاد، صفحہ ۱۰)

تنگ نظری ـــ ترقی کی راہ کا سنگ گراں:

اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگ گراں کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے دامن پر اس کا داغ نہ آنے دیں۔ قومی زندگی کی صحت اگر مخدوش ہوتی ہے تو صرف اسی مرض سے! فکر و عمل کے ہر گوشے میں یہ خرابی راہ پا جاتی ہے۔ یہ وبا ایک بہروپیے کی طرح نت نئے بھیس بدلتی رہتی ہے۔

(پٹنہ یونیورسٹی میں تقریر، دسمبر ۱۹۴۷)

پانے کا مزہ:

یہاں پانے کا مزہ انہیں کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔

(نقوش ابوالکلام آزاد، ص ۷۹)

ماوراء عقل:

وہ ساری باتیں جن کا امکان انسانی دماغ میں آسکتا ہے عقل کے مطابق ہیں۔ اس میں سے کوئی بھی خلاف عقل نہیں البتہ اس کا کیا علاج کہ خود تمہاری ہی عقل راہ خلاف میں گم ہے۔ تم نے تو آج تک یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ کسی بات کے ماوراء عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلاف عقل بھی ہو۔

سر روحانیاں داری ولے خود راندیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

(افکار آزاد، صفحہ ۱۲۶)

دماغی موسم اور معنوی مزاج:

آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے۔ مثلاً جاڑوں میں آم۔ چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے۔ نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ کے بھیجتے ہیں۔ لیکن جو علت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی، وہی

بے لذتی کی بھی ہو گئی۔ کھایئے تو مزہ نہیں ملتا اور مزہ ملے تو کیسے ملے؟ جو موسم ابھی نہیں آیا، اس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی، اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصے میں آئے تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے، اس لیے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی، کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے دے کر خریدیں گے اور کہیں گے ،یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو، ارزاں ہے!

غور کیجیے تو انسان کے افکار و اعمال کی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے، موسم کے دماغ بھی اگا کرتے ہیں۔ اور پھر جس طرح یہاں کا ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق اس کی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہیں، اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے، اور ضروری ہے کہ اسی کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں۔ لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اُس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوئیں، اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور شواذ سے خالی نہیں، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشوونما کے کاروبار کا نقص کہیے، یا زمانہ کی غلط اندیشی وقت (Anachronism) لیکن بہر حال ایسا ہونا ضرور ہے۔ ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئیں گی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہوں گی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکیں گی۔ نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکے گا۔ تاہم چونکہ انکی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے ،اس لیے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتیں۔ لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کریں گے۔

(غبار خاطر، صفحہ ۲۳۔ ۱۲۲)

خود شناسی:

زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے مگر ہم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضاء آسمانی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر

ابھی تک اس کی خود شناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آکر بڑھاوے دیتا تھا، لیکن اس کے اندر کا چولھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی:

کلیمؔ شکوہ ز توفیق چند؟ شرمت باد!

تو چوں برہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند؟

لیکن جونہی اُس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اُٹھی، اور اُسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرند ہوں" اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔ وہی جسم زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق دار تڑپ نے اُس کا پورا جسم ہلا کر اُچھال دیا۔ اور پھر جو دیکھا، تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے، اور مرغ ہمت، عقاب دار فضاء لامتناہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ وللہ درما قال۔

بال بکشاؤ صفیر از شجر طوبیٰ زن

حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے، تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے:

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے

ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم!

اڑنے کے سروسامان میں سے کون سی چیز تھی جو اس نوگرفتار قفسِ حیات کے حصے میں نہیں آئی تھی؟ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اسے بھیجا تھا، اور ماں کے اشارے دمبدم گرم پروازی کے لیے اُبھار رہے تھے۔ لیکن جب تک اس کے اندر کی خود شناسی بیدار نہیں ہوئی، اور

اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائر بلند پرواز ہے، اُس کے بال و پر کا سارا سر و سامان بیکار رہا۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خودشناسی بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامہ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو نہی اس کے اندر کا عرفان جاگ اٹھا، اور اسے معلوم ہو گیا کہ اسکی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلاب حال انجام پا جاتا ہے، اور ایک ہی جست میں حضیض خاک سے اُڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے، خواجہ شیراز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

چہ گویمت کہ بمے خانہ دوش مستِ خراب — سروشِ عالم غیبم چہ مژدہ ہا داد ست

کہ "اے بلند نظر، شاہباز سدرہ نشین — نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد ست

تراز کنگرۂ عرشِ می زنند صفیر — ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست"

(غبار خاطر، صفحہ ۲۷۸۔۸۰)

دلِ زندہ:

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خود رو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں۔ صبح اب بھی ہر روز مسکرائیگی۔ چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اُس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دینگے؟

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ! تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اُس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد ست

"عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد ست!"

باہر کے سارے سازو سامان عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دمیدش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واں دراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ''ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم''؟
گفت ''آں روز کہ ایں گنبد مینا میکرد!''

(غبار خاطر، ص ا۔۱۰۰)

شاخ بریدہ:

یہاں احاطے کے شمالی گوشے میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لدرہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لیے کوئی انقلاب حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی پڑی ہے۔

یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے، جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت، سب اس کے لیے یکساں ہو گئے۔

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں، لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ہے، ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا!

(غبار خاطر، ص ۹۲۔۲۹۱)

محبت حسینؓ کا اقتضا:

کسی روح کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسینؓ کی مدعی ہو، جب تک کہ اسوۂ

حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

(مضامین ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، صفحہ ۹۰)

فرض کی ادائیگی:

فرض اس امر کا محتاج نہیں کہ نتیجہ کب اور کیا پیدا ہوگا۔ اگر فرض فرض ہے تو تمہیں چاہیے کہ تم پورا کرو۔ نتیجے پر غور کرنا تمہارا کام نہیں۔

(ذکر آزاد، صفحہ ۱۵۶)

جام سرشاری:

اس میکدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتار دام تخیل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے کوئی نہ کوئی جام سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اسی میں بے خود رہتا ہے:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد، اما
در مجلس او مستی ہر یک زشرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے، کوئی کانٹوں سے، اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے۔

(غبار خاطر، صفحہ ۷۳)

مقصد اور وسیلہ وذریعہ:

دنیا کے ہر فکر، ہر عمل اور ہر سعی کو دیکھیے! آپ دیکھیں گے کہ ایک چیز وہ ہوتی ہے، جس کو "مقصد" کہتے ہیں اور ایک چیز وہ جو اس مقصد کو عمل میں لائے اور اس کے وسائل وذرائع سے عبارت ہے۔ مقصد نہیں بدل سکتا۔ نہ اسکو وقت بدل سکتا ہے اور نہ اور کوئی شی۔ البتہ ذرائع میں حسبِ حالت تبدیلی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ سنت اللہ اس کی مقتضی ہے اور بغیر اس کے حصول فتح متعذر!

(تبرکات آزاد، ص ۲۸)

عدم یا وجود مع النقائص:

ابتدا میں تو کوئی کام بھی بلا انتظار و تدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے، نقائص رفتہ رفتہ دور ہو جائیں۔ عدم سے وجود مع النقائص بہ ہر حال بہتر ہے

اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام ہو۔ (تبرکات آزاد، ص ۹۶)

ظہورِ استعداد کا اندرونی اور بیرونی محل:

دنیا میں ہر چیز کی تخلیق و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضان فطرت سے اکتساب فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو اور اس استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے، دوسرا بیرونی۔ جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کر لے گی، دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی۔ خارج کے نشوونما کے لیے داخل کا نشوونما بمنزلہ سبب و علت ہے، جب تک سبب موجود نہ ہوگا، نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے۔

(رسولِ رحمت، ص ۲۱۴)

معاشرت کا فلسفہ اور اصلاح معاشرت کا عمل:

اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجیے اور ایک انجمن قائم کیجیے۔ ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو اُن پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں، ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائے گا، عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا، جس کے خصائص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاح معاشرت نہیں ہے۔ (تبرکات آزاد، ص ۱۰۴)

معاندانہ مخالفت:

جب کبھی اختلاف رائے معاندانہ مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور جو چیز ایک شخص کی نظروں میں سفید ہوتی ہے، وہ دوسرے کو سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عقل و دماغ کی سرتاسر جذبات کی مخلوق ہے۔

وعين الرضاعن كل عيب كليلة
كما أن عين السخط تبدى المساويا

(افکار آزاد، صفحہ ۴۲)

حوالہ جات

۱۔ آثار و نقوش، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، ابوالکلام آزاد، ری سرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء

۲۔ آزاد کی تقریریں، مرتب انور عارف، مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۱ء

۳۔ ابوالکلام آزاد --- آثار و افکار

۴۔ اذکار آزاد، مرتب سید عباس حاجی مدراسی، شیخ قمرالدین تاجر کتب، لاہور، ۱۹۴۶ء

۵۔ افاداتِ آزاد، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی ۱۹۸۴ء (آزاد صدی ایڈیشن)

۶۔ افسانۂ ہجر و وصال، الہلال بک ایجنسی، لاہور، ۱۹۵۶ء (طبع ثانی)

۷۔ افکار آزاد، مرتب محمد عثمان فارقلیط، مکتبۂ آزاد، لاہور، ۱۹۴۵ء

۸۔ الدین والسیاست، کتب خانہ نئی جنتری بجنور۔

۹۔ الہلال۔ کلکتہ (مختلف شمارے)

۱۰۔ ایلاو تخیر، الہلال بک ایجنسی۔ لاہور۔

۱۱۔ تبرکات آزاد، مرتب غلام رسول مہر، کتاب منزل۔ لاہور، ۱۹۵۹ء (پہلا ایڈیشن)

۱۲۔ تذکرہ، جامع و مرتب فضل الدین احمد، البلاغ پریس، کلکتہ، ۱۹۱۹ء (پہلا ایڈیشن)

۱۳۔ ترجمان القرآن (جلد اول) ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء (دوسری اشاعت)

۱۴۔ ایضاً (جلد دوم): ایضاً ۱۹۶۶ء (پہلی اشاعت)

۱۵۔ ایضاً (جلد سوم): ایضاً ۱۹۷۷ء (دوسری اشاعت)

۱۶۔ ایضاً (جلد چہارم): ایضاً ۱۹۷۷ء (دوسری اشاعت)

۱۷۔ تقریر پٹنہ یونیورسٹی، ۱۹۴۷ء

۱۸۔ تقریر اجلاس جمعیۃ العلماء ہند، لاہور، ۱۹۴۲ء

۱۹۔ تقریر اجلاس کانگریس۔ میرٹھ، ۱۹۴۶ء

۲۰۔ جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری ابوالکلام آزاد ری سرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان۔ کراچی، ۱۹۹۶ء

۲۱۔ خطبات آزاد، اردو کتاب گھر۔ دہلی، ۱۹۵۹ء

۲۲۔ خطبات آزاد، مرتب ملک رام، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء (پہلا ایڈیشن)

۲۳۔ خطباتِ ابوالکلام آزاد، ادبستان۔ لاہور

۲۴۔ خطباتِ جمعات و عیدین، مرتب سیف صدیقی، زمزم بک ایجنسی، لاہور۔

۲۵۔ خطبۂ صدارت صوبائی مجلس خلافت۔ آگرہ

۲۶۔ دعوت عمل۔ قومی دارالاشاعت، میرٹھ۔

۲۷۔ ذکرِ آزاد، مصنف ملیح آبادی (مولانا عبدالرزاق)، آزاد ہند کلکتہ، ۱۹۶۰ء

۲۸۔ رسولِ رحمت۔ مرتب غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور، ۱۹۷۰ء (پہلا ایڈیشن)

۲۹۔ صدائے حق، مرتب مسعود الحسن، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۳۰۔ صدائے حق، قومی دارالاشاعت، میرٹھ

۳۱۔ غبارِ خاطر، مرتب محمد اجمل خاں، مکتبۂ احرار، لاہور، ۱۹۶۴ء (تیسرا اصلاح واضافہ شدہ ایڈیشن)

۳۲۔ غبار خاطر، مرتب مالک رام، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۶۷ء (پہلا ایڈیشن)

۳۳۔ کاروانِ خیال، مرتب عبدالشاہد خاں شروانی، مدینہ پریس، بجنور، ۱۹۴۶ء (پہلا ایڈیشن)

۳۴۔ مساجد اسلامیہ اور خطباتِ سیاسیہ، قومی دارالاشاعت، میرٹھ (ماخوذ از الہلال، ۸، ۱۵، ۲۲ و ۲۹ / اکتوبر اور ۵ / نومبر ۱۹۱۳ء کی پانچ قسطوں میں)

۳۵۔ مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، البلاغ پریس کلکتہ، ۱۹۲۰ء (دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن)

۳۶۔ مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ دوم)، مرتب بدرالحسن، ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۴۴ء

۳۷۔ مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ اول)، قومی دارالاشاعت، میرٹھ

۳۸۔ ایضاً (حصہ دوم)، ایضاً ایضاً

۳۹۔ ایضاً (حصہ سوم)، ایضاً ایضاً

۴۰۔ مضامین ابوالکلام آزاد (حصہ چہارم)، قومی دارالاشاعات، میرٹھ

۴۱۔ ایضاً پیش لفظ رفیع انور، فرنٹیر بک ڈپو، لاہور

۴۲۔ مقالات آزاد، مرتب عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور ۱۹۴۳ء

۴۳۔ مقام دعوت، الہلال بک ایجنسی۔ لاہور، ۱۹۴۵ء، (پہلی بار)، ماخوذ از البلاغ ۱۰، ۱۷، ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء و ۱۴، ۲۱، و ۲۸ر جنوری ۱۹۱۶ء، (مشترکہ شمارہ)

۴۴۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتب ابو سلمان شاہ جہاں پوری، اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی ۱۹۶۸ء، (پہلی بار)

۴۵۔ نقش آزاد، مرتب غلام رسول مہر، کتاب منزل۔ لاہور، ۱۹۵۸ء، (پہلا ایڈیشن)

۴۶۔ نقوش ابوالکلام آزاد، مرتب محمد یونس خالدی، مولانا آزاد میموریل اکادمی۔ لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، (پہلی بار)

۴۷۔ نوادرِ ابوالکلام، مرتب ظہیر احمد خاں ظہیر، ناشر و مصنف بذات خود... ۱۹۶۶ء

۴۸۔ ہندوستان میں ابن تیمیہ، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، مطبوعاتِ دانش، لاہور، ۲۰۰۰ء

☆☆☆

Faizan-i-Abul Kalam

Thought provoking extracts from Writings and Speeches of Maulana Abul Kalam Azad

Compiled by

Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna